نبی اکرم ﷺ سے ہمارے تعلق کی بنیادیں

ڈاکٹر اسرار احمد

پیش لفظ

(جو تیسرے ایڈیشن کے لئے تحریر کیا گیا تھا)

یہ ایک تقریر ہے جو راقم الحروف نے اوائل ۱۹۷۳ء میں ناظم آباد کراچی کے بلاک نمبر ۵ کی جامع مسجد میں ماہ ربیع الاول کی مناسبت سے کی تھی۔ محترم شیخ جمیل الرحمٰن صاحب کی ہمت کہ انہوں نے اسے ٹیپ سے صفحہ قرطاس پر منتقل کیا اور معمولی حک واضافے کے ساتھ ۱۹۷۴ء میں کراچی ہی سے شائع کر دیا۔ میری خواہش یہ تھی کہ اسے از سرِ نو مرتب کر کے ''مسلمانوں پر نبی اکرم ﷺ کے حقوق'' کے عنوان سے شائع کروں' لیکن بوجوہ اس کی نوبت نہ آئی اور احباب کے تقاضے پر اسے دوبارہ اسی صورت میں ۷۷ء میں مرکزی مکتبہ تنظیم اسلامی لاہور سے شائع کر دیا گیا۔ خیال یہ تھا کہ تیسری بار اشاعت کی نوبت آئی تو نئی ترتیب دے لوں گا' لیکن افسوس کہ اس بار بھی اسے جوں کا توں ہی شائع کرنا پڑ رہا ہے۔ ویسے اس تقریری انداز کا ایک فائدہ بھی ہے کہ یہ نسبتاً زیادہ عام فہم ہے' اس لئے اس کا حلقۂ افادہ وسیع رہے گا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں نبی اکرم ﷺ کے ساتھ اپنے تعلقات کی اساسات اور ان کے مضمرات کا صحیح فہم بھی عطا فرمائے اور ان پر عملاً کاربند ہونے کی توفیق بھی مرحمت فرمائے۔ آمین

خاکسار اسرار احمد عفی عنہ

لاہور' یکم ربیع الاول

۱۳۹۹ھ

عرض ناشر

(برائے بار سیزدہم)

''نبی اکرم ﷺ سے ہمارے تعلق کی بنیادیں'' کا تیرھواں ایڈیشن پیش خدمت ہے۔ اس بار اشاعت سے قبل اس کتابچے پر بھرپور طور پر نظرثانی کی گئی ہے۔ چنانچہ جہاں ضرورت محسوس کی گئی' عبارت کو زیادہ واضح اور آسان فہم بنانے کے لئے مناسب اصلاح کر دی گئی ہے' مزید برآں قارئین کی سہولت کے لئے اس کتابچے میں شامل آیات و احادیث کے باقاعدہ حوالے بھی درج کر دیئے گئے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ نئی کمپیوٹر کتابت کے ذریعے اس کتابچے کے حسنِ ظاہری کو بہتر بنانے کا بھی کس قدر سامان کر دیا گیا ہے۔ گویا اس کتابچے کو از سرِ نو مرتب کرنے کا جو کام محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے پیش نظر تھا وہ اللہ کے فضل و کرم سے کسی نہ کسی درجے میں اب پورا ہو گیا ہے۔ فللّٰہ الحمدُ والمنّة

ناظم نشر و اشاعت
مرکزی انجمن خدام القرآن' لاہور
۲۰/اپریل ۹۴ء

نحمدہٗ ونصلی علٰی رسولہِ الکریم ...... امّا بعد:

اعوذ باللّٰہ من الشّیطٰن الرَّجیم ۔ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

قال اللّٰہ عزوجل فی القرآن المجید :

﴿فَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا بِہٖ وَعَزَّرُوۡہُ وَنَصَرُوۡہُ وَاتَّبَعُوا النُّوۡرَ الَّذِیۡۤ اُنۡزِلَ مَعَہٗۤ ۙ اُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ﴾ ...... صدق اللّٰہ العظیم

ربیع الاول کے مہینہ میں چونکہ نبی اکرم ﷺ کی ولادت باسعادت ہوئی تھی' لہٰذا اس مہینہ میں خاص طور پر سیرت کی مجالس اور جلسے منعقد ہوتے ہیں جن میں عموماً حضور ﷺ کی سیرۃ مطہرہ پر تقاریر ہوتی ہیں' آپ ﷺ کی خدمت میں سلام پڑھے جاتے ہیں اور نذرانۂ عقیدت کے طور پر نعتیں بھی پیش کی جاتی ہیں۔ اظہارِ محبت و عقیدت کے یہ طور طریقے اختیار کر کے ہم مسلمانوں کو عام طور پر یہ مغالطہ لاحق ہو جاتا ہے کہ ہم نے بحیثیتِ امتی اپنی ذمہ داری پوری کر دی اور نبی اکرم ﷺ کے جو حقوق ہم پر عائد ہوتے ہیں وہ ہم نے ادا کر دیئے۔ یہ جھوٹا اطمینان (Pseudo Satisfaction) عام طور پر ہمیں اس طرف متوجہ نہیں ہونے دیتا کہ ہم یہ بات معلوم کرنی کی کوشش کریں کہ از روئے قرآن حکیم نبی اکرم ﷺ سے ہمارے تعلق کی حقیقی اساسات اور صحیح بنیادیں کیا ہیں؟ حالانکہ سیرت کی مجالس کا اصل حاصل یہ ہونا چاہئے کہ ہم یہ سوچیں اور طے کریں کہ نبی اکرم ﷺ سے ہمارے تعلق کی صحیح نوعیت کیا ہے اور ہم سے خدا کے ہاں آنحضور ﷺ کے بارے میں کس بات کا محاسبہ ہو گا؟ پھر اس ضمن میں جہاں جہاں کمی اور جس جس پہلو سے کوتاہی نظر آئے اس کا ازالہ کرنے کی پوری کوشش کریں۔ اگر ہم یہ ارادہ لے کر سیرت کی کسی مجلس میں شریک ہوں اور ایسا کوئی عزم لے کر وہاں سے اٹھیں تو یہ یقیناً فائدے کی بات ہے اور آخرت کے اعتبار سے نفع بخش ہے۔

حضور ﷺ سے نسبت کے تقاضوں کو واضح کرنے کے لئے میں اس موضوع پر

قدرے تفصیل سے کچھ گفتگو کرنا چاہتا ہوں کہ از روئے قرآن مجید نبی اکرم ﷺ سے ہمارے تعلق کی صحیح بنیادیں کیا ہیں۔ اس کے لئے میں نے سورۃ الاعراف کی آیت ۱۵۷ کا آخری جزو منتخب کیا ہے:

﴿فَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا بِہٖ وَعَزَّرُوۡہُ وَنَصَرُوۡہُ وَاتَّبَعُوا النُّوۡرَ الَّذِیۡۤ اُنۡزِلَ مَعَہٗۤ اُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ﴾

''پس جو لوگ ایمان لائے ان (نبی اکرم ﷺ پر) اور جنہوں نے انؐ کی توقیر و تعظیم کی' اور جنہوں نے انؐ کی مدد اور حمایت کی (یعنی ان کے مشن میں ان کے دست و بازو بنے' اور ان کے مقاصد کی تکمیل میں اپنی صلاحیتوں اور توانائیوں کو کھپایا) اور جنہوں نے اس نور کا اتباع کیا جو انؐ کے ساتھ نازل کیا گیا ہے' تو یہی ہیں وہ لوگ جو فلاح پانے والے ہیں۔''

جس آیتِ کریمہ کا آخری جزو اِس وقت ہمارے پیشِ نظر ہے وہ پوری آیت اگر سامنے ہو تو معلوم ہوگا کہ اس میں اصل مخاطب اہلِ کتاب یعنی یہود و نصاریٰ سے ہے اور ان کو مخاطب کر کے فرمایا گیا ہے کہ یہی وہ "الرسول النبی الامی" ہیں جن کے بارے میں پیشین گوئیاں تمہاری کتابوں تورات اور انجیل میں موجود ہیں اور جن کی آمد کی خوش خبری انبیاء سابقین دیتے چلے آ رہے تھے۔ ہمارے یہ رسول (ﷺ) تمہارے پاس آ گئے ہیں' یہ تم کو نیکی کا حکم دیتے ہیں' برائیوں سے روکتے ہیں' تمہارے لئے پاکیزہ چیزوں کو حلال اور ناپاک چیزوں کو حرام قرار دے رہے ہیں' اور تم نے شریعت کے نام سے اپنے اوپر جو بیجا وزن اور بوجھ لاد رکھے ہیں اور رسوم و قیود کی جو بیڑیاں پہن رکھی ہیں' ان سے تم کو نجات دلا رہے ہیں...... اس کے بعد اس آیت میں وہ الفاظ آئے ہیں جو اس وقت ہمارے زیرِ مطالعہ ہیں:

﴿فَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا بِہٖ وَعَزَّرُوۡہُ وَنَصَرُوۡہُ وَاتَّبَعُوا النُّوۡرَ الَّذِیۡۤ اُنۡزِلَ مَعَہٗۤ اُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ﴾

آیت کریمہ کے اس حصہ پر غور کرنے سے نبی اکرم ﷺ کے ساتھ تعلق کی چار بنیادیں ہمارے سامنے آتی ہیں:

☆ پہلی یہ کہ حضور ﷺ پر ایمان لایا جائے' آپؐ کی تصدیق کی جائے۔

☆ دوسری یہ کہ حضور ﷺ کی توقیر و تعظیم کی جائے۔

☆ تیسری یہ کہ حضور ﷺ کی نصرت و حمایت کی جائے۔

☆ چوتھی کہ یہ حضور ﷺ پر جو نورِ ہدایت یعنی قرآن مجید نازل ہوا ہے اس کی پیروی کی جائے اور اپنی زندگی کے ہر عمل کے لئے اس مینارۂ نور سے ہدایت و رہنمائی حاصل کی جائے۔

اب میں چاہوں گا کہ ان چاروں بنیادوں کے متعلق علیحدہ علیحدہ کچھ وضاحتیں پیش کر دی جائیں' جو اگرچہ تفصیل کی متقاضی ہیں لیکن میں کوشش کروں گا کہ اختصار کے ساتھ وہ باتیں بیان کر دی جائیں جو ہمارے لئے غور و فکر کی راہیں کھول سکیں۔

۱۔ ایمان

متذکرہ بالا آیت کے حوالے سے جو سب سے پہلی بات ذہن نشین کرنی ضروری ہے وہ یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ سے ہمارے تعلق کی بنیادی نوعیت یہ ہے کہ ہم آپؐ پر ایمان لاتے ہیں اور آپؐ کی تصدیق کرتے ہیں۔ نیز آپ ﷺ کو اللہ کا نبی' اللہ کا رسول' اللہ کا فرستادہ اور اللہ کا پیغامبر تسلیم کرتے ہیں۔ اس اقرار و یقین کا نام ''ایمان'' ہے اور اسی سے ہمارے اور حضور ﷺ کے مابین ایک تعلق اور رشتہ کا آغاز ہوتا ہے۔ اُمتِ مسلمہ میں اگرچہ سادات اور ہاشمی بھی کثیر تعداد میں موجود ہیں' لیکن عظیم اکثریت یقیناً ان لوگوں کی ہے جن کا کوئی نسل اور خون کا تعلق نبی اکرم ﷺ کے ساتھ نہیں ہے۔ بایں ہمہ ہر اُمتی کو حضورؐ کے ساتھ ایک نسبت و تعلق حاصل ہے اور یہی تعلق سب سے اہم اور سب سے مضبوط تعلق ہے' یعنی ایمان کا تعلق' اس یقین کا تعلق کہ محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں جو پورے عالم کے لئے ہادی و رہنما بنا کر مبعوث کئے گئے اور جو تمام بنی نوعِ آدم کے لئے بشیر و نذیر بنا کر بھیجے گئے۔ بفحوائے الفاظِ قرآنی:

﴿وَمَاۤ اَرۡسَلۡنٰکَ اِلَّا کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیۡرًا وَّنَذِیۡرًا﴾ (سبا: ۲۸)

''اور (اے نبی ﷺ ہم نے آپؐ کو نہیں بھیجا مگر تمام انسانوں کے لئے بشارت دینے والا اور خبردار کرنے والا (بنا کر!)''

اکثر و بیشتر حضرات کے علم میں ہوگا کہ اس ایمان کے دو درجے ہیں۔ ایمانِ مجمل کے الفاظ میں ان دو درجوں کے لئے دو اصطلاحیں آئی ہیں' ایک اِقرارٌ بِاللِّسان اور دوسری تَصدِیقٌ بِالقَلب ۔ یعنی حضور ﷺ پر ایمان کے ضمن میں زبان سے اس امر کا اقرار کہ محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں اور دل سے اسی بات کی تصدیق اور اسی پر یقینِ کامل رکھنا۔ ان کو آپ ایمان کے دو درجے' دو مراتب' یا دو پہلو کہہ سکتے ہیں اور جب یہ دونوں باہم دگر ایک وحدت بنیں گے تب ہی درحقیقت ایمان مکمل ہوگا۔ اگر صرف زبان سے اقرار ہے لیکن دل میں یقین نہیں تو یہ ایمان نہیں' بلکہ اسے نفاق کہا جائے گا۔ مدینہ طیبہ کے منافقین زبان سے حضور ﷺ پر ایمان لانے کا اقرار کرتے تھے' بلکہ آپؐ کے پیچھے نمازیں پڑھتے تھے' روزے رکھتے تھے' زکوٰۃ ادا کرتے تھے' لیکن ان کے دل نورِ یقین سے خالی تھے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کے ہاں ان کا ٹھکانا جہنم قرار پایا' بلکہ جہنم کا بھی سب سے نچلا حصہ۔ از روئے الفاظ قرآنی: ﴿اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ فِی الدَّرْکِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ ۞﴾ یعنی ''منافق تو آگ سے سب سے نچلے درجے میں ہوں گے۔'' اسی طرح کوئی شخص دل میں تو حضور ﷺ کی رسالت کا یقین رکھتا ہو' لیکن زبان سے اس کا اقرار نہ کرے تو قانونِ شریعت کی رو سے ایسا شخص کافر قرار پائے گا۔ دنیا میں وہی شخص مسلم قرار پائے گا جو زبان سے کلمۂ شہادت کا اقرار کرے کہ اَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ اور آخرت میں وہی شخص مومن قرار پائے گا جو اقرار باللسان کے ساتھ تصدیق بالقلب کی دولت سے بھی مالا مال ہو' جو دل والے یقین کے ساتھ یہ ایمان رکھتا ہو کہ بے شک محمد ﷺ بن عبداللہ بن عبدالمطلب' اللہ کے آخری نبی اور رسول ہیں اور ان پر اللہ کی آخری کتاب نازل ہوئی ہے جو ابدالآباد تک محفوظ رہے گی۔ غرضیکہ اقرار باللسان اور تصدیق بالقلب لازم و ملزوم ہیں اور ایمان کی تکمیل ان دونوں کے ارتباط و اشتراک سے ہوگی۔

۲۔ توقیر و تعظیم

ایمان کے دونوں درجوں کو لازم و ملزوم سمجھنے سے یہ بات خود بخود منطقی طور پر سمجھ میں آجائے گی کہ ایمان جب یقینِ قلبی کے درجے تک پہنچتا ہے تو اس کے نتیجے کے طور پر انسان کے عمل میں کچھ اثرات لازماً پیدا ہونے چاہئیں...... اس ایمان کا پہلا لازمی نتیجہ تو وہ ہے جو اسی آیت میں ایمان کے ذکر کے بعد ''عَزَّرُوْهُ'' کے الفاظ میں آیا ہے۔ ''فَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ'' یعنی ''پس وہ لوگ جو محمد ﷺ پر ایمان لائے اور جنہوں نے ان کی توقیر و تعظیم کی'' گویا ایمان کا پہلا تقاضا توقیر و تعظیم ہے۔ جب حضور ﷺ کے بارے میں یہ یقین حاصل ہوگیا کہ آپؐ ہمارے خالق' ہمارے مالک' ہمارے آقا اور ہمارے پروردگار کے فرستادہ ہیں' اس کے پیغامبر ہیں' اس کے رسول ہیں' جنہیں اس نے ہماری ہدایت و رہنمائی کے لئے مبعوث فرمایا ہے اور حضور ﷺ نے جو کچھ پیش فرمایا ہے' جو تعلیم دی ہے' جو احکام دیئے ہیں' جو خبریں دی ہیں' جو امر و نواہی بتائے ہیں' حلال و حرام کی جو قیود عائد فرمائی ہیں' ان میں سے کوئی بات بھی انہوں نے اپنے جی سے پیش نہیں کی ہے بلکہ ہر بات اللہ کی طرف سے پیش فرمائی ہے' جیسا کہ سورۃ النجم میں ارشاد ہوا: ﴿وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰی ۞ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی ۞﴾ ''اور یہ (رسول ﷺ) اپنی خواہشِ نفس سے نہیں بولتے۔ یہ تو صرف وحی ہے جو (ان پر) بھیجی جاتی ہے۔'' پس معلوم ہوا کہ ایمان کا پہلا فطری اور لازمی نتیجہ حضور ﷺ کی توقیر و تعظیم اور آپ کا ادب و احترام ہے۔

سورۃ الحجرات میں اس ادب و احترام اور توقیر و تعظیم کی شرح بیان ہوئی ہے جو مسلمانوں سے مطلوب ہے اور جو انہیں ملحوظ رکھنا چاہئے۔ چنانچہ فرمایا:

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَکُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِیِّ وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ کَجَهْرِ بَعْضِکُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُکُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ ۞﴾ (آیت ۲)

''اے ایمان والو! مت بلند کرو اپنی آوازوں کو نبیؐ کی آواز پر اور نہ ان سے گفتگو میں آواز کو اس طرح بلند کیا کرو جس طرح تم باہم ایک دوسرے سے گفتگو کرتے ہوئے اپنی آواز بلند کرتے ہو' مبادا تمہارے اعمال برباد ہو جائیں اور تمہیں شعور تک نہ ہو۔''

شعور واحساس تو اسی وقت ہوتا ہے جب انسان یہ سمجھے کہ وہ حضور ﷺ کی کسی نافرمانی کا مرتکب ہو رہا ہے۔ غور کیجئے کہ یہاں رسول ﷺ کی نافرمانی اور معصیت کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوا بلکہ مجرد سوئے ادب کی وجہ سے سارے نیک اعمال اکارت ہونے کی وعید سنائی جا رہی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی نافرمانی اور حکم عدولی اور حضور ﷺ کی رائے کو پسِ پشت ڈال دینا تو بڑی دور کی بات ہے' جس کے معصیت ہونے میں کوئی کلام نہیں' محض یہ سوئے ادب کہ رسول اللہ ﷺ کی آواز پر اپنی آواز کو بلند کر دیا جائے تو اس پر کیسی دھمکی دی گئی ہے اور کیسی زبردست تنبیہہ کی گئی ہے کہ حضور ﷺ کے معاملے میں ایسی بے احتیاطی برتنے کے سبب سے اب تک کے تمام کئے کرائے پر پانی پھر جائے گا' تمہاری سب نیکیاں برباد ہو جائیں گی اور تمہیں معلوم تک نہ ہو گا کہ تم نے اس بے ادبی اور بے احتیاطی سے کیا کچھ کھو دیا اور تم کیسے عظیم نقصان اور خسارہ سے دوچار ہو گئے۔ اس لئے کہ تم اس مغالطہ میں رہو گے کہ ہم نے حضور ﷺ کی کوئی حکم عدولی تو نہیں کی اور ہم سے کسی معصیتِ صریحہ کا ارتکاب تو نہیں ہوا۔ سورۃ الحجرات کی اس آیتِ مبارکہ سے یہ بات واضح طور پر سامنے آ جاتی ہے کہ ایمان بالرسالت کا پہلا لازمی نتیجہ نبی اکرم ﷺ کا ادب واحترام اور آپؐ کی توقیر وتعظیم ہے۔

اب اسی ایمان کے دو مضمرات رسول اللہ ﷺ کی دو مشہور احادیث کے حوالہ سے آپ کے سامنے لانا چاہتا ہوں...... ان میں سے ایک ہے اطاعتِ رسول ﷺ اور دوسرا ہے محبتِ رسول ﷺ۔

اطاعت

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

لَا يُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰى يَكُوْنَ هَوَاهُ تَبَعًا لِّمَا جِئْتُ بِهٖ

''تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کی خواہشِ نفس اس (ہدایت) کے تابع نہ ہو جائے جو میں لے کر آیا ہوں۔''

یہ حدیث مشکوٰۃ المصابیح میں ''شرح السنۃ'' کے حوالے سے نقل کی گئی ہے۔ اس حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ ایمان کا دعویٰ کرنے کے بعد جب تک ان تمام احکامِ شریعت' حدود وقیود اور اوامر ونواہی کو دلی آمادگی کے ساتھ تسلیم نہیں کیا جاتا جو رسول اللہ ﷺ نے قرآن وسنت کے ذریعے سے پیش فرمائے ہیں اور جب تک اپنے نفس کی خواہشات کو کچلتے ہوئے قرآن وسنت پر عمل کا جذبہ بیدار نہیں ہوتا تب تک ایمان کا تقاضا پورا نہیں ہوتا۔ پس معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کی کامل اطاعت اور قرآن وسنت کے احکام پر سرِ تسلیم خم کرنا ایمان بالرسالت کی شرطِ لازم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں جہاں جہاں اللہ کی اطاعت کا حکم ملے گا وہاں اللہ کے رسول ﷺ کی اطاعت کا حکم بھی ساتھ ہی موجود ہو گا۔ مثلاً سورۂ آل عمران (آیت ۳۲) میں ارشاد ہوا: ﴿قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ﴾ اسی طرح سورۃ التغابن (آیت ۱۱۲) میں فرمایا گیا: ﴿وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ﴾ یعنی ''اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسولؐ کی۔'' جب محمد ﷺ کو اللہ کا رسول اور اس کا نمائندہ مان لیا ہے تو اب تمہارے لئے اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں کہ تمہیں ان ﷺ کا ہر حکم ماننا پڑے گا اور ہر ارشاد کے آگے سرِ تسلیم خم کرنا ہو گا۔

اللہ تعالیٰ کی یہ سنت ہے کہ وہ جس رسول کو بھی بھیجتا ہے اس حکم کے ساتھ بھیجتا ہے کہ اس کی اطاعت کی جائے' جیسا کہ سورۃ النساء (آیت ۶۴) میں فرمایا: ﴿وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ﴾ ''اور ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اسی لئے کہ اللہ کے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے۔'' اسی سورۂ مبارکہ میں آگے فرمایا: ﴿مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ﴾ (آیت ۸۰) ''جس شخص نے رسول کی

اطاعت کی‘ اس نے اللہ کی اطاعت کی۔‘‘ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ حکم دینے کے لئے ہمارے پاس خود نہیں آتا‘ اس نے اپنے احکام ہم تک پہنچانے کے لئے انبیاء و رسل کو واسطہ بنایا ہے‘ لہٰذا اب خدا کی اطاعت کا ذریعہ بھی رسولؐ کی اطاعت ہے۔ اسی بات کو حضور ﷺ نے اسی طرح فرمایا کہ ((مَنْ اَطَاعَنِیْ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهُ وَمَنْ عَصَانِیْ فَقَدْ عَصَی اللّٰهُ)) ’’جس نے میری اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی‘ اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے اللہ کی نافرمانی کی۔‘‘ (متفق علیہ‘ عن ابی ہریرہؓ)

نبی اکرم ﷺ کی اطاعت کے لزوم کے لئے سورۃ النساء کی آیت ۶۵ بھی پیش نظر رہنی چاہئے۔ فرمایا:

﴿فَلَا وَرَبِّکَ لَا یُؤْمِنُوْنَ حَتّٰی یُحَکِّمُوْکَ فِیْمَا شَجَرَ بَیْنَهُمْ ثُمَّ لَا یَجِدُوْا فِیْۤ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَیْتَ وَیُسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا ﴿۶۵﴾﴾

’’پس نہیں‘ آپؐ کے رب کی قسم! یہ لوگ ہرگز مومن نہیں ہوں گے جب تک اپنے نزاعات میں آپ ہی کو حکم نہ مانیں‘ پھر آپ جو فیصلہ کریں اس پر اپنے دلوں میں کوئی تنگی محسوس نہ کریں اور اسے پوری خوش دلی کے ساتھ قبول کرلیں۔‘‘

یہ آیتِ مبارکہ حضور ﷺ کے واجب الاطاعت ہونے کے لئے نصِ قطعی ہے۔ رسول محض مان لینے کے لئے نہیں بھیجا جاتا بلکہ وہ اس لئے مبعوث کیا جاتا ہے کہ اس کی کامل اطاعت کی جائے‘ اس کے تمام فیصلے تسلیم کئے جائیں‘ اس کے جملہ احکام کی تعمیل کی جائے‘ اس کی سنت کی پیروی کی جائے اور اس کے نقشِ قدم کو رہنما بنایا جائے۔ حضور ﷺ کو صرف مرکزِ عقیدت سمجھ لینا ہرگز کافی نہیں بلکہ ایمان اور توقیر و تعظیم کے لازمی عملی نتیجہ کے طور پر آپ کو مرکزِ اطاعت تسلیم کرنا ضروری ہے۔ اس اطاعتِ کلی کے بغیر ایمان کا اقرار ایک زبانی دعویٰ تو قرار پائے گا‘ لیکن یہ حقیقی ایمان کے اعتبار سے خدا کے ہاں معتبر نہیں ہوگا۔

محبت

نبی اکرم ﷺ پر ایمان اور آپؐ کی توقیر و تعظیم کا دوسرا لازمی نتیجہ آپؐ سے محبت ہے۔ صرف زبردستی‘ مجبوری اور مارے باندھے کی اطاعت تو کسی جابر حکمران اور جابر اقتدار کی بھی کی جاسکتی ہے بلکہ کی جاتی ہے۔ لیکن جب یہ اطاعت رسول ﷺ کے لئے مطلوب ہو تو پھر زبردستی کی اطاعت نہیں‘ بلکہ وہ اطاعت مطلوب ہوتی ہے جو انتہائی گہری محبت‘ دل کی پوری آمادگی اور پورے انبساطِ قلب اور شرحِ صدر کے ساتھ ہو‘ کیونکہ رسول اللہ ﷺ کی محبت لوازمِ ایمان میں سے ہے۔ اس ضمن میں خود نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے:

لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی اَکُوْنَ اَحَبَّ اِلَیْهِ مِنْ وَّالِدِهٖ وَوَلَدِهٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ (متفق علیه‘ عن انس بن مالکؓ)

’’تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہوسکتا جب تک میں اس کے لئے اس کے باپ‘ اس کے بیٹے اور تمام انسانوں سے محبوب تر نہ ہوجاؤں۔‘‘

یعنی اگر ایک مسلمان کے دل میں حضور ﷺ کی محبت اپنے تمام اعزہ و اقارب اور تمام انسانوں سے بڑھ کر جاگزیں نہیں ہوئی ہے تو وہ شخص حقیقتاً مومن نہیں۔ حدیثِ مبارک کے الفاظ میں کوئی ابہام نہیں ہے‘ بلکہ بڑے واضح الفاظ میں صاف صاف اور دوٹوک انداز میں ایسے شخص کے ایمان کی نفی کردی گئی ہے جسے نبی اکرم ﷺ کی ذاتِ گرامی دنیا کے تمام انسانوں سے بڑھ کر محبوب نہیں ہے۔ اگر نبی اکرم ﷺ کی محبت تمام محبتوں پر غالب نہیں آتی تو درحقیقت آپؐ پر صحیح معنوں میں وہ ایمان ہی حاصل نہیں ہوا جو خدا کے ہاں معتبر ہے اور جس کی بنیاد پر اس کی عدالت سے جزا و سزا کے فیصلے صادر ہوں گے۔

اس ضمن میں حضرت عمر فاروقؓ کا واقعہ منقول ہے کہ ایک مرتبہ نبی اکرم ﷺ نے ان سے سوال کیا: ’’عمرؓ تمہیں مجھ سے کتنی محبت ہے؟‘‘ ذرا اندازہ لگایئے کہ اس گفتگو سے کس قدر اپنائیت کا احساس ابھرتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ حضورِ اقدس ﷺ اور عمر فاروقؓ کے مابین کس قدر قلبی و ذہنی قرب موجود تھا۔ سوال کا انداز خود بتارہا ہے کہ یہ سوال اس ہستی سے کیا جاسکتا ہے جس کی محبت اور شیفتگی مسلم ہو۔ حضرت عمرؓ نے

جواباً عرض کیا کہ ''حضورِ آپؐ مجھے دنیا کے ہر انسان اور ہر شے سے زیادہ محبوب ہیں۔''
حضور ﷺ نے پھر دریافت فرمایا: ''اور خود اپنی جان سے بھی؟'' اس پر حضرت عمرؓ نے
کچھ توقف کیا اور پھر عرض کیا: ''الان''، یعنی ہاں حضور! اب میں یہ بھی کہتا ہوں کہ آپؐ
مجھے میری جان سے زیادہ محبوب اور عزیز ہیں۔ حضرت عمرؓ نے حضور ﷺ کے سوال کا
جواب سوچ سمجھ کر، اپنا جائزہ لے کر اور اپنے دل کے اندر جھانک کر دیا۔ ہمارے نعت
گو حضرات کی طرح نہیں کہ زبانی جمع خرچ کرنے پر ہی اکتفا ہو اور دعویٰ محبت میں
زمین و آسمان کے قلابے ملا دیئے جائیں، الا ماشاء اللہ۔ حضرت عمرؓ کا جواب سن کر
حضور ﷺ نے فرمایا کہ ہاں اب تم مقامِ مطلوب تک پہنچے ہو۔ یعنی اگر میں تمہیں ہر
چیز، ہر انسان یہاں تک کہ اپنی جان سے بھی محبوب تر ہو گیا ہوں تو اب صحیح تعلق پیدا ہوا
جو اللہ کو مطلوب ہے۔

اتباع

دل کی حقیقی محبت، طبیعت کی پوری آمادگی اور ایک گہرے قلبی لگاؤ کے ساتھ جب
انسان کسی کی پیروی کرتا ہے تو وہ صرف اس حکم ہی کی پیروی نہیں کرتا جو وہ اپنی زبان
سے واضح الفاظ میں دے رہا ہو، بلکہ وہ اس کی ہر ادا کی پیروی کو اپنے لئے باعثِ
سعادت سمجھتا ہے اور اس کے چشم و ابرو کے اشاروں کا منتظر رہتا ہے۔ وہ یہ دیکھتا ہے کہ
میرے محبوب کو کیا پسند ہے اور کیا ناپسند، اس کی نشست و برخاست کا طریقہ کیا ہے، ان
کی گفتگو کا انداز کیا ہے، چلتے کس طرح ہیں، وہ لباس کون سا پہنتے ہیں، انہیں کھانے میں
کیا چیز مرغوب ہے۔ ان چیزوں کے بارے میں خواہ کبھی کوئی حکم نہ دیا گیا ہو، لیکن جس
کے دل میں کسی کی حقیقی محبت جاگزیں ہو جائے، جو کسی کا والہ و شیفتہ ہو جائے، اس کے
لئے وہ احکام جو الفاظ میں دیئے گئے ہوں، زبان سے ارشاد فرمائے گئے ہوں یا وہ کام
جن کے کرنے کی ترغیب و تشویق دلائی گئی ہو ان کا تو کہنا ہی کیا، وہ تو ہیں ہی واجب
التعمیل، ایسے شخص کے لئے تو چشم و ابرو کا اشارہ بھی حکم قطعی کا درجہ رکھتا ہے۔ اس کی ہر ہر
ادا کی نقالی اور اس کے ہر قدم کی پیروی وہ اپنے اوپر لازم کر لیتا ہے۔ گویا ۔

جہاں تیرا نقشِ قدم دیکھتے ہیں
خیاباں خیاباں اِرم دیکھتے ہیں

اس طرزِ عمل کا نام ''اتباع'' ہے۔ جس کی بڑی تابناک مثالیں ہمیں صحابہ کرامؓ کی
زندگیوں میں نظر آتی ہیں۔ سیرت کی کتابوں میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے
بہت سے واقعات مرقوم ہیں جن سے ان کے جذبۂ اتباع کا پتہ چلتا ہے۔ وہ ایک سفر
میں حضور ﷺ کے ساتھ تھے، اتفاق سے حضور ﷺ کا گزر ایک خاص درخت کے
نیچے سے ہوا، لیکن حضرت ابن عمرؓ نے ہمیشہ کے لئے لازم کر لیا کہ جب کبھی ان کا اس
راستہ سے گزر ہوتا تو وہ اس درخت کے نیچے سے ہو کر گزرتے۔ اسی طرح حجۃ الوداع
کے سفر میں حضور ﷺ نے دورانِ سفر جہاں پڑاؤ کیا، جہاں جہاں استراحت فرمائی
اور جہاں حوائج ضروریہ سے فراغت پائی، حضرت ابن عمرؓ نے سفرِ حج میں انہی مقامات
پر پڑاؤ، استراحت اور رفعِ حاجت کا التزام کیا، حالانکہ انہیں حضور ﷺ کی طرف سے
ایسا کوئی حکم نہیں دیا گیا تھا اور شریعت کے لحاظ سے آپ ﷺ کے یہ اعمال واجب
التعمیل بھی نہیں تھے، بلکہ خالص عقلیت پسند (Rationalist) لوگ تو شاید اس کو
جنون اور خواہ مخواہ کا Fantacism کہیں۔ لیکن یہ معاملہ عشق و محبت کا معاملہ ہے
جس میں محبوب کے ہر نقشِ قدم کی پیروی دستورِ محبت شمار ہوتی ہے۔ اگر کوئی فنا فی حبِ
الرسول ﷺ ہو جائے تو اس کا طرزِ عمل اور رویہ یہی ہونا چاہئے۔ اسی طرح سیرِ صحابہؓ
میں ایک صحابیؓ کا ذکر ملتا ہے جو کسی دور دراز علاقہ سے آ کر حضور ﷺ کے ہاتھ پر
مشرف باسلام ہوئے تھے۔ انہوں نے حضور ﷺ کو بس اسی ایک موقع پر دیکھا اور
اتفاق سے اس وقت حضور ﷺ کا گریبان کھلا تھا۔ آپ ﷺ کو کھلے گریبان کے
ساتھ دیکھ کر ان صحابیؓ نے پھر ساری عمر اپنے گریبان کے بٹن نہیں لگائے، اس لئے کہ
انہوں نے محمد رسول اللہ ﷺ کو اسی حال میں دیکھا تھا۔ حالانکہ حضور ﷺ کی طرف
سے انہیں ایسا کوئی حکم تو کجا، کسی ادنیٰ درجے میں اشارہ تک نہیں کیا گیا، اور اسی شریعت
کی رو سے یہ نہ فرض ہے نہ واجب، لیکن یہ محبت کے لوازم میں سے ہے کہ محبوب کے ہر

نقشِ قدم کی پیروی اور ہر ادا کی نقالی اپنے اوپر لازم کر لی جائے۔ اسی طرزِ عمل کا نام قرآن مجید کی اصطلاح میں اتباع ہے۔

اتباعِ رسول کا قرآن مجید میں جو مقام ہے وہ سورۂ آلِ عمران کی آیت ۳۱ کے مطالعہ سے سامنے آتا ہے۔ فرمایا گیا:

﴿قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝﴾

''اے نبی ﷺ) آپ فرما دیجئے کہ اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میرا اتباع کرو' (اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ) اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمہاری خطاؤں کو معاف فرما دے گا' اور اللہ بہت معاف کرنے والا اور بہت رحم فرمانے والا ہے۔''

اس آیتِ کریمہ سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ سے محبت کا لازمی تقاضا نبی اکرم ﷺ کا اتباع ہے۔ اس اتباع کا ایک نتیجہ تو یہ نکلے گا کہ ہم اللہ کی محبت میں پختہ تر اور مضبوط تر ہوتے چلے جائیں گے اور دوسرا نتیجہ یہ نکلے گا کہ ہم اللہ کے محبوب اور اس کی مغفرت و رحمت کے سزاوار قرار پائیں گے۔ جن کو یہ مرتبہ مل جائے کہ وہ اللہ کے محبوب قرار پائیں ان کی خوش نصیبی اور خوش بختی کا کیا کہنا!

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آگے بڑھنے سے پیشتر ہم اب تک کی گفتگو کے اہم نکات کا اعادہ کر لیں اور اس کے لبِ لباب کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیں۔ نبی اکرم ﷺ سے ہمارے تعلق کی اولین اور اہم ترین بنیاد حضور ﷺ پر ایمان لانا ہے۔ اس ایمان کا زبانی اقرار بھی ضروری ہے اور قلبی یقین بھی۔ پھر ایمان کا اولین تقاضا حضور ﷺ کی توقیر و تعظیم اور آپ ؐ کا کما حقہ ادب و احترام ہے۔ آپ ؐ پر ایمان اور آپ ؐ کی توقیر و تعظیم کے دو ناگزیر لوازم ہیں۔ ایک اطاعتِ کلی اور دوسرے محبتِ قلبی جو ہر دوسری چیز کی محبت پر غالب ہو اور جب یہ دونوں جمع ہوں گی تو اس کا نام ''اتباع'' ہے اور اللہ تعالیٰ کے ہاں اصلاً یہی مطلوب ہے۔ چنانچہ سورۂ آلِ عمران میں اس کے بارے میں فرمایا گیا کہ اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو نبی اکرم ﷺ کا اتباع اپنے اوپر لازم کر لو' اس کے نتیجے میں اللہ تم سے محبت کرے گا' تم اللہ کے چہیتے بن جاؤ گے اور وہ تمہارے گناہ بھی معاف فرما دے گا۔

انتباہ

یہاں پر اس بات کو بھی اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ ایمان اور توقیر و تعظیم کے ان دونوں ناگزیر لوازم میں سے اگر ایک بھی غائب ہو تو اس ادھورے طرزِ عمل سے آخرت میں نجات کی توقع ایک امیدِ موہوم سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی۔ اگر حضور ﷺ پر ایمان کا دعویٰ بھی ہے' اس کے ساتھ ساتھ مارے باندھے کی اطاعت بھی ہو رہی ہے' لیکن محبت نہیں ہے' اطاعت میں دلی آمادگی نہیں ہے یُسَلِّمُوْا تسلیمًا کی کیفیت نہیں ہے' دل میں تنگی اور اپراہٹ ہے' تو اس طرزِ عمل میں منافقین کے ساتھ ایک مشابہت اور مماثلت پیدا ہو جاتی ہے۔ حضور ﷺ کے دور کے منافقین بھی ایمان لانے کے ساتھ ایک مشابہت اور مماثلت پیدا ہو جاتی ہے۔ حضور ﷺ کے دور کے منافقین بھی ایمان لانے کے مدعی تھے اور وہ آپ ؐ کی اطاعت بھی کرتے تھے' لیکن یہ ان کی مجبوری تھی۔ وہ معاشرہ آج جیسا تو نہیں تھا کہ مسلمان کہلانے والے اطاعتِ رسول ﷺ تو درکنار رسول اللہ ﷺ کے احکام کا استہزاء کریں' جنت و دوزخ اور جزا و سزا کا مذاق اڑائیں' ملائکہ اور نزولِ وحی کے منکر ہوں' سنتِ رسول ﷺ کے التزام سے انکار کریں اور اسلام کے نظامِ زندگی کو آج کے دور کے لئے ناقابلِ عمل قرار دیں' لیکن پھر بھی مسلمان کہلائیں اور ان کا شمار مسلمانوں میں کیا جائے۔ اس معاشرہ کا حال تو یہ تھا کہ جس کسی نے اپنے آپ کو مسلمانوں میں شمار کرانا تھا اور خود کو مسلمان کہلانا تھا اس کے لئے اللہ کے رسول ﷺ کی اطاعت سے سرتابی ممکن ہی نہ تھی۔ وہ اس پر مجبور تھا کہ نماز پڑھے' شعائرِ دین کا احترام کرے اور فرائضِ دین کی ادائیگی کا اہتمام کرے۔ لہٰذا منافقین یہ سارے جتن کرتے تھے بلکہ قسمیں کھا کھا کر حضور ﷺ کو اپنے صادق و مخلص ہونے کا یقین دلاتے تھے' لیکن ان کو جو متاعِ عزیز حاصل نہیں تھی' وہ تھی یقینِ قلبی اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی حضور ﷺ سے حقیقی و واقعی محبت۔ چنانچہ خود اللہ تعالیٰ نے

سورۃ المنافقون میں فیصلہ فرمادیا کہ:

﴿اِذَا جَآءَكَ الْمُنٰفِقُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُهٗ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ ﴾

"(اے نبی ﷺ) جب منافق آپ کے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں۔ اور اللہ جانتا ہے کہ آپ اس کے رسول ہیں اور اللہ گواہی دیتا ہے کہ منافق بلاشبہ (اپنے قول میں) جھوٹے ہیں۔"

یعنی ان کی یہ بات تو اپنی جگہ سچی اور صداقت پر مبنی ہے کہ آپؐ اللہ کے رسول ہیں، لیکن چونکہ یہ دل سے آپؐ کی رسالت کے قائل نہیں، ان کے دلوں میں آپؐ کی حقیقی محبت موجود نہیں، صرف زبان سے اقرار کرتے ہیں، ان کا باطن کچھ اور ہے اور ظاہر کچھ اور، اس لئے یہ جھوٹے ہیں اور ان کے قول کا کوئی اعتبار نہیں۔ پس ثابت ہوا کہ قلبی یقین اور محبت کے بغیر اگر اطاعت ہو رہی ہو تو اس میں منافقین کے ساتھ ایک مشابہت پیدا ہوتی ہے۔

اس کے برعکس اگر یہ طرزِ عمل اختیار کیا جائے کہ محبتِ رسول ﷺ کے محض دعوے ہیں لیکن اطاعت نہیں، فرائض کی ادائیگی نہیں، اوامر ونواہی کی پرواہ نہیں، احکامِ شریعت کا سرے سے کوئی لحاظ نہیں، تو یہ طرزِ عمل سراسر معصیت اور فسق و فجور پر مبنی ہے۔ محبت کا یہ خالی خولی دعویٰ اللہ کے ہاں سرے سے قبول ہی نہیں ہوگا۔ ایسا دعویٰ تو اس دنیا میں بھی قبول نہیں ہوسکتا بلکہ مہمل قرار پاتا ہے کہ ایک طرف محبت کا دعویٰ ہو اور دوسری طرف اطاعت اور رضا جوئی کا سرے سے کوئی اہتمام نہ ہو۔ کسی بیٹے کو والد کی محبت کا دعویٰ ہو لیکن وہ ان کا کہنا نہ مانتا ہو بلکہ ہر عمل والد کی مرضی کے خلاف انجام دیتا ہو تو معقول بات یہ ہے کہ بیٹے کے اس دعویٰ محبت کو دنیا میں کہیں تسلیم نہیں کیا جائے گا۔ اسی طرح عشقِ رسول ﷺ اور محبتِ رسول ﷺ کے بلند بانگ دعاوی، بڑی وجد آفریں نعتیں اور بڑے لمبے چوڑے سلام، بڑے جوش وخروش اور شان وشوکت سے نکالے ہوئے جلوس اور بڑے ہی اہتمام کے ساتھ منعقد کی ہوئی میلاد کی محفلیں اور مجالسِ سیرت اگر جذبۂ اطاعت سے خالی اور پیرویٔ سنت کے جذبہ سے عاری ہیں تو یہ سب کچھ سراپا ڈھونگ ہے، فریبِ نفس ہے، اس کی کوئی حقیقت نہیں، میزان میں اس کا کوئی وزن نہیں، اور اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کی پرکاہ کے برابر بھی وقعت نہیں، بلکہ یہ سب قابلِ مواخذہ ہیں۔

۳۔ نصرتِ رسول ﷺ

آیت زیرِ مطالعہ میں نبی اکرم ﷺ سے ہمارے تعلق کی تیسری بنیاد "وَنَصَرُوْهُ" کے الفاظ میں بیان ہوئی ہے، یعنی "جن لوگوں نے حضور ﷺ کی مدد اور حمایت کی۔" اس موضوع پر آگے بڑھنے سے پہلے ہمیں یہ بات طے کرنی چاہئے کہ رسول ﷺ کی نصرت و حمایت اور ان کی مدد کس کام میں اور کس مقصد کے لئے مطلوب ہے۔ نبوت و رسالت ایک فریضۂ منصبی ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے انبیاء و رسل کو تفویض کیا جاتا ہے۔ یعنی بھٹکے ہوؤں کو سیدھی راہ دکھانا، نیند کے ماتوں کو جگانا، انسان کو شرک کے اندھیاروں میں سے نکال کر توحید کے روشن صراطِ مستقیم پر لا کھڑا کرنا، اسے اعمالِ صالحہ اور مکارمِ اخلاق کا خوگر بنانا، انسان پر سے انسان کی خدائی کو ختم کرنا، معاشرہ میں سے ہر قسم کے جور و استبداد اور استحصال کا خاتمہ کرنا، اور انسان کو یہ یقین دلانا کہ ایک دن وہ بھی آنے والا ہے کہ جس روز انسان کو اپنے مالک وآقا اور خالق کے سامنے محاسبہ کے لئے کھڑا ہونا ہوگا، از روئے الفاظ قرآنی: ﴿يَوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ اور ﴿يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْئًا وَّالْاَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِّلّٰهِ ﴾ یعنی جس روز لوگ رب العالمین کے سامنے کھڑے ہوں گے اور جس روز کوئی کسی کا بھلا نہ کر سکے گا، کوئی کسی کے کام نہ آ سکے گا۔ جس روز انسان کی اس دنیا کی کمائی اور سعی و جہد کا نتیجہ اس کے سامنے ہوگا۔ برے اعمال اور طغیانی و سرکشی کی پاداش میں اسے جہنم میں جھونک دیا جائے گا، اور جس نے اللہ کے سامنے کھڑے ہو کر جواب دہی کے خوف کے پیشِ نظر اپنے نفس کے لئے بے لگام گھوڑے کو قابو میں رکھا ہوگا تو جنت اس کا ٹھکانہ ہوگی۔ بجوائے الفاظ قرآنی:

﴿يَوْمَ يَتَذَكَّرُ الْاِنْسَانُ مَا سَعٰى ۞ وَبُرِّزَتِ الْجَحِيْمُ لِمَنْ يَّرٰى ۞ فَاَمَّا مَنْ طَغٰى ۞ وَاٰثَرَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ۞ فَاِنَّ الْجَحِيْمَ هِيَ الْمَاْوٰى ۞ وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ۞ فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى ۞﴾ (النازعات : ۳۵۔۴۱)

''جس روز انسان اپنا سب کیا دھرا یاد کرے گا اور ہر دیکھنے والے کے سامنے دوزخ کھول کر رکھ دی جائے گی' تو جس نے سرکشی کی تھی اور دنیا کی زندگی کو ترجیح دی تھی تو وہ دوزخ ہی اس کا ٹھکانا ہوگی اور جس نے اپنے رب کے سامنے کھڑے ہونے کا خوف کیا تھا اور نفس کو بری خواہشات سے باز رکھا تھا تو جنت اس کا ٹھکانہ ہوگی!

تبلیغ کا بارِگراں

دعوت وتبلیغ کا کٹھن کام' شرک کے اندھیروں کو دور کر کے نورِ توحید پھیلانے کی یہ بھاری ذمہ داری' بدمستوں اور مدہوشوں کی اصلاح کا یہ مشکل کام' طاغوت سے پنجہ آزمائی اور باطل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر حق کی سربلندی اور اقامتِ دین کے جان جھوکھوں کے یہ مراحل طے کرنا' یہ تھا وہ بارِگراں جو نبوت و رسالت سے سرفراز ہونے کے نتیجہ میں محمد رسول اللہ ﷺ کے کندھوں پر آیا تھا۔ اس بارِگراں کی خبر حضور ﷺ کو نبوت کے آغاز ہی میں دے دی گئی تھی۔ چنانچہ سورۃ المزمل میں فرما دیا گیا تھا: ﴿اِنَّا سَنُلْقِيْ عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيْلًا ۞﴾ یعنی ''ہم عنقریب آپؐ پر ایک بھاری فرمان نازل کریں گے' ایک بھاری بوجھ ڈالیں گے۔'' اور یہ بھاری فرمان اور بھاری بوجھ چند ہی دنوں بعد حضور ﷺ کے شانوں پر رکھ دیا گیا' چنانچہ سورۃ المدثر میں حکم آ گیا: ﴿يٰٓاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۞ قُمْ فَاَنْذِرْ ۞ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۞﴾ یعنی ''اے کپڑا اوڑھ کر لیٹنے والے! کھڑے ہو جاؤ اور خبردار کرو (نیند کے ماتوں کو جھنجھوڑو' ان کو ہوشیار کرو' ان کو باطل عقائد اور غلط اعمال کے انجامِ بد سے ڈراؤ) اور اپنے رب کی کبریائی کا اعلان کرو۔''

سورۃ المدثر کی تیسری آیت میں نبی اکرم ﷺ کو ''تکبیرِ رب'' کا حکم دیا گیا ہے' جس کے معنی صرف اللہ اکبر کہہ دینا اور اللہ کی بڑائی بیان کر دینا ہی نہیں بلکہ فی الواقع وہ نظام قائم اور برپا کر دینا ہے جس میں تشریعی حیثیت سے بھی اللہ تعالیٰ ہی کو حاکمِ اعلیٰ اور مقتدرِ مطلق (Absolute Sovereign) تسلیم کیا جائے' اسی کا حکم حرفِ آخر ہو' اسی کی مرضی تمام مرضیوں پر حاوی ہو جائے اور سیدنا حضرت مسیح علیہ السلام کے بقول جس طرح اس کی مرضی آسمانوں میں پوری ہوتی ہے اسی طرح زمین پر بھی پوری ہو' اسی کا جھنڈا تمام جھنڈوں سے بلند تر ہو جائے اور اسی کی بات سب باتوں پر غالب ہو جائے۔ بفحوائے الفاظِ قرآنی: ﴿وَكَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَاء﴾ ''اور بات تو اللہ ہی کی غالب و بلند ہے۔'' کبریائی تو واقعتاً وہ کبریائی ہے جو عملاً قائم ہو' محض کتابوں میں لکھی ہوئی کبریائی تو کوئی کبریائی نہیں اور محض زبان سے کہہ دینے سے تو کسی کی بڑائی اور کبریائی قائم نہیں ہوتی' بلکہ بڑائی اور کبریائی تو دراصل وہی ہے جس کو بالفعل بڑائی اور کبریائی تسلیم کیا گیا ہو۔ چنانچہ ''تکبیرِ رب'' کا حقیقی مفہوم یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کی زمین پر اس کے احکام' اس کی ہدایات اور اس کے اوامر ونواہی کی تعمیل کی جا رہی ہو' اس کا عطا کردہ آئین اور اس کے نازل کردہ قوانین عملاً نافذ ہوں' اور اس طرح اسے حقیقی طور پر مقتدر تسلیم کیا گیا ہو۔

دعوت وتبلیغ کی غایتِ اولیٰ

مدنی دور میں اس بات کو مزید واضح کر دیا گیا کہ نبی اکرم ﷺ چونکہ خاتم الانبیاء والمرسلین ہیں' لہٰذا دعوت وتبلیغ کے ساتھ ساتھ اظہارِ دینِ حق اور غلبۂ دینِ متین بھی نہ صرف آپؐ کے فرائضِ رسالت میں شامل ہے بلکہ آپ ﷺ کی بعثت کی غایتِ اولیٰ ہے۔ چونکہ تا قیامِ قیامت کوئی اور رسول یا نبی آنے والا نہیں لہٰذا بنی نوعِ انسان پر اتمامِ حجت کے لئے اللہ تعالیٰ نے جہاں اپنی آخری کتاب اور مکمل ہدایت نامے قرآن مجید کی حفاظت کا خود ذمہ لیا وہاں یہ بھی ضروری قرار دیا کہ دینِ حق بہ تمام وکمال قائم بھی ہوتا کہ انسان کے لئے کوئی عذر پیش کرنے کا موقع باقی نہ رہے۔ یہ مضمون مدنی دور کی تین سورتوں' سورۃ التوبہ (آیت ۳۳) سورۃ الفتح (آیت ۲۸) اور سورۃ الصف

(آیت ۹) میں وضاحت کے ساتھ کھول دیا گیا:

﴿هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ﴾

''وہی ہے (اللہ) جس نے بھیجا اپنے رسول (محمد ﷺ) کو الہدیٰ (قرآن حکیم) اور دین حق (اسلام) دے کر تاکہ وہ اس (ہدایت اور دین حق) کو پورے کے پورے دین (نظامِ حیات) پر غالب کر دے۔''

تو یہ تھا وہ بھاری بوجھ جو نبی اکرم ﷺ کے کاندھوں پر رکھا گیا تھا اور ظہورِ نبوت کے وقت صورت حال یہ تھی کہ آپ ؐ اس وقت پورے عالمِ انسانی میں اس دعوت کے علمبردار کی حیثیت سے بالکل یکہ وتنہا تھے۔ دنیا کے بتکدہ میں توحید کا غلغلہ بلند کرنا' تکبیرِ رب کا نعرہ لگانا' خدا کی کبریائی کو عملاً نافذ کرنے کی جدوجہد کرنا' اظہار وغلبۂ دین کے لئے کشمکش کرنا' امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا داعی بن کر کھڑا ہونا' اعمالِ صالحہ اور مکارمِ اخلاق کی دعوت کا علم بلند کرنا اور ظلم وتعدّی' جوروستم اور استبداد واستحصال کے خلاف سینہ سپر ہونا کوئی آسان کام تو نہیں تھا' اسی لئے اسے ''قولِ ثقیل'' سے تعبیر کیا گیا۔ تکبیرِ رب کی خاطر کھڑے ہونے کا مطلب پورے معاشرہ سے اعلانِ جنگ تھا اور حضور ﷺ کو حکم تھا کہ ﴿قُمْ فَاَنْذِرْ ۞ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۞﴾ یعنی ''کھڑے ہو جاؤ' پس (بنی نوع انسان کو) خبردار کرو! اور اپنے رب کی بڑائی کا اعلان کرو!''...... آپ ؐ سے فرمایا گیا کہ آپ ؐ اس فریضۂ رسالت کی ادائیگی فرماتے رہیں اور ''وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ'' اور ''وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ'' کے مصداق چاہے مشرکوں اور کافروں کو یہ کتنا ہی ناگوار گزرے۔ وہ لوگ جن کے مفادات پر ضرب پڑ رہی ہو وہ کتنا ہی راستہ روکیں اور مزاحمت کریں' وہ لوگ جن کی جھوٹی مذہبی قیادتیں خطرہ میں پڑ گئی ہوں وہ چاہے کتنی مخالفتیں کریں' کتنی ہی صعوبتیں پہنچائیں' ظلم وتشدد کا کتنا ہی بھیانک مظاہرہ کریں اور جور وتعدی کے کتنے ہی پہاڑ توڑیں' ان تمام مخالفتوں' مظالم اور استبداد کے علی الرغم' ان تمام موانع کے باوجود اور ان تمام شدائد ومصائب کے باوصف نبی اکرم' سرورِ عالم' محبوبِ خدا' رحمت للعالمین' خاتم الانبین والمرسلین محمد رسول اللہ ﷺ کے فرائضِ منصبی میں شامل تھا کہ تکبیرِ رب کا جھنڈا بلند کرنے کے لئے طاغوتی طاقتوں سے پنجہ آزمائی کریں' باطل قوتوں سے نبرد آزما ہوں اور اس راستے میں ہر نوع کے شدائد و مصائب اور ہر طرح کے طنز واستہزاء اور طعن وتشنیع کے وار برداشت کریں۔ یہ وہ بھاری بوجھ اور بھاری ذمہ داری تھی جو محمد رسول اللہ ﷺ کے کاندھوں پر ڈالی گئی تھی۔

آنحضور ؐ کے اُمتی کی اہم ترین ذمہ داری

نبی اکرم ﷺ کے فرضِ منصبی کے ادراک سے نصرتِ رسول ﷺ کا مفہوم خود بخود واضح ہو جاتا ہے اور یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ جو شخص حضور ﷺ پر ایمان لائے اور اس کا دل اس بات کی تصدیق کرے کہ محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں' اس کے لئے لازم ہے کہ اب فریضۂ رسالت ونبوت کی ادائیگی میں حضور ﷺ کا رفیق وناصر بنے۔ اب اسے تکبیرِ رب کی کٹھن مہم میں' اقامتِ دین اور غلبۂ دین کی جاں گسل جدوجہد میں' دعوت وتبلیغ کے راہِ خارزار میں' حق و باطل کے معرکۂ کارزار میں اور جہاد وقتال فی سبیل اللہ کے میدان جنگ و جدال میں حضور ﷺ کا دست و بازو اور آپ ؐ کا حامی و مددگار بننا ہوگا۔ جہاں حضور ﷺ کا پسینہ گرے وہاں وہ اپنا خون بہانے کو اپنے لئے باعثِ فخر وسعادت سمجھے' اسے حضور ﷺ کے مشن کی تکمیل کے لئے سر دھڑ کی بازی لگانے اور اس بازی میں نقدِ جان کی نذر گزارنے میں فوز وفلاح اور کامیابی وکامرانی کا یقین ہو' اس کا جینا اور مرنا حضور ﷺ کی دعوت کی تبلیغ واشاعت کے لئے ہو' اس کا مال ومنال اور اس کی صلاحیتیں اور توانائیاں اس دینِ حق کے غلبے کے لئے وقف ہوں' جو خالقِ کائنات اور رب العالمین کی طرف سے نبی اکرم ﷺ کو دے کر مبعوث فرمایا گیا۔ اگر حضور ﷺ پر ایمان لانے والوں کا نصب العین اور مقصدِ حیات ﴿اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُكِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۞﴾ ''نہ ہو تو ان کا ایمان باللہ اور ایمان بالرسالت کا دعویٰ غیر معتبر ہے' اور مغالطے اور فریبِ نفس پر مبنی ہے۔ چنانچہ نبی اکرم ﷺ سے ہمارے تعلق کی تیسری بنیاد نصرتِ رسول ﷺ ہے۔

لفظِ نصرت سے کسی کو یہ خیال آ سکتا ہے کہ اللہ کے نبی ؐ اور رسول کو کسی انسان کی

مدد کی کیا حاجت؟ نبی ﷺ کا مقام ومرتبہ تو یہ ہے کہ اللہ خود ان کا مولا اور ناصر ہے‘ پھر اللہ کے فرشتے نبیؐ کے پشت پناہ ہیں‘ اور نبیؐ کو تو روح القدس کی تائید حاصل ہوتی ہے‘ لہٰذا نبیؐ کو اہلِ ایمان کی مدد وحمایت کیا کیا ضرورت؟ پس اس نکتہ کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ اس عالمِ اسباب میں دینِ حق کے غلبہ کی جدوجہد انسانوں ہی کو کرنی ہے‘ جن کو زمین میں اللہ کے خلیفہ قرار دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ انسانوں کی ہدایت ورہنمائی کے لئے انبیاء ورُسل کو دینِ حق کے ساتھ مبعوث فرماتا ہے۔ قبولِ حق کی استعداد فطرتِ انسانی میں پہلے سے ودیعت شدہ ہوتی ہے۔ پھر آفاق وانفس میں اللہ کی آیات انبیاء ورُسل کی دعوت کے قبول کرنے میں مددگار رہوتی ہیں۔ ان کی صداقت کے ثبوت کے لئے ان پر آسمانی کتابوں کا نزول بھی ہوتا ہے جو واضح اور روشن آیات پر مشتمل ہوتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں کو حسّی معجزات از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿اِنَّا ھَدَیۡنٰہُ السَّبِیۡلَ اِمَّا شَاکِرًا وَّاِمَّا کَفُوۡرًا ۝﴾ یعنی ”ہم نے تو انسان کو سیدھی راہ سجھا دی ہے‘ اب وہ حق کو تسلیم کرے یا ناشکری کرے!“..... بہرحال اقامتِ دین‘ شہادتِ حق اور دعوت وتبلیغ کی جدوجہد انسانوں ہی کو کرنی ہوتی ہے۔ نبی اس دعوت وتبلیغ کا داعیٔ اول ہوتا ہے اور وہی سب سے پہلے دین کے سامنے شاہد بن کر کھڑا ہوتا ہے‘ جیسا کہ سورۃ الاحزاب (آیات ۴۵‘۴۶) میں فرمایا گیا:

﴿یٰۤاَیُّھَا النَّبِیُّ اِنَّاۤ اَرۡسَلۡنٰکَ شَاھِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِیۡرًا ۝ وَّدَاعِیًا اِلَی اللّٰہِ بِاِذۡنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیۡرًا ۝﴾

”اے نبی (ﷺ) ہم نے آپ کو گواہی دینے والا‘ بشارت دینے والا اور خبردار کرنے والا‘ اللہ کی اجازت سے اس کی طرف دعوت دینے والا اور روشن چراغ بنا کر بھیجا ہے۔“

امتحان اور آزمائش

پھر جو لوگ نبیؐ کی دعوت قبول کریں اور اس پر ایمان لائیں‘ اللہ تعالیٰ عزوجل اس عالمِ اسباب میں ان کو جانچتا ہے‘ ان کا امتحان لیتا ہے۔ چنانچہ اس عالمِ علت ومعلول اور عالمِ اسباب میں اگر دین پھیلے گا تو اللہ پر‘ رسولؐ پر اور آخرت پر یقین رکھنے والے مومنینِ صادقین کی جانفشانیوں اور سرفروشیوں‘ ان کے ایثار وقربانی اور ان کی جدوجہد سے پھیلے گا۔ دنیا میں تشریعی طور پر اللہ کی کبریائی اگر فی الواقع قائم ہوگی تو ان ہی کی کشاکش‘ محنت اور جہاد وقتال سے قائم ہوگی۔ وہ خاک وخون میں لوٹیں گے اور راہِ حق میں نقدِ جان کا نذرانہ گزاریں گے تو اللہ کی تائید ونصرت سے اللہ کا دین غالب ہوگا۔ یہی سنت اللہ ہے‘ اور اللہ کو ایسے ہی جوانمردوں سے محبت ہے۔ بفحوائے الفاظِ قرآنی:

﴿اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الَّذِیۡنَ یُقَاتِلُوۡنَ فِیۡ سَبِیۡلِہٖ صَفًّا کَاَنَّھُمۡ بُنۡیَانٌ مَّرۡصُوۡصٌ ۝﴾ (الصف : ٤)

”یقیناً اللہ ان کو محبوب رکھتا ہے جو اس کی راہ میں اس طرح صفیں باندھ کر جنگ کرتے ہیں گویا کہ وہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہوں۔“

اور انہی سرفروشوں کے بارے میں شاعر نے کہا ہے ؎

بنا کردند خوش رسمے بخاک وخون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

اسی جدوجہد اور کشمکش میں مومنینِ صادقین کی آزمائش ہے۔ اسی سے معلوم ہوگا کہ کون واقعتاً ایمان رکھتا ہے اور کون ایمان کا جھوٹا دعویدار ہے۔ اس جہاد وقتال کے ذریعے حضور ﷺ کے مشن کی تکمیل میں سردھڑ کی بازی لگانے کے عمل کو اللہ تعالیٰ نصرتِ رسول ﷺ سے تعبیر کرتا ہے اور یہ نصرتِ رسول ﷺ ہی وہ کسوٹی ہے جس پر عالمِ رنگ وبو میں سچے اور کھوٹے پرکھے جاتے ہیں‘ جیسا کہ سورۃ العنکبوت (آیت ۱۱) میں فرمایا: ﴿وَلَیَعۡلَمَنَّ اللّٰہُ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَلَیَعۡلَمَنَّ الۡمُنٰفِقِیۡنَ ۝﴾ ”اور اللہ تعالیٰ ظاہر کر دے گا ان کو بھی جو (واقعتاً) ایمان لائے ہیں اور ان کو بھی جو منافق ہیں۔“ یعنی اللہ تعالیٰ کھول کر رکھ دے گا کہ کون حقیقتاً ایمان رکھتے ہیں اور کون جھوٹ موٹ کے مومن بنے پھرتے ہیں جو حقیقتِ واقعی کے لحاظ سے منافق ہیں۔ اس دنیا میں ایمان ونفاق کا فیصلہ انہی آزمائشوں‘ ان ہی سرفروشیوں اور ان ہی جانفشانیوں سے ہوتا ہے کہ

ایمان کا دعویٰ کرنے کے بعد رسول اللہ ﷺ کے جھنڈے کو اٹھایا یا نہیں اٹھایا؟ رسول ﷺ کے مشن کو اپنی زندگی کا مشن بنایا یا نہیں بنایا؟ محمد رسول اللہ ﷺ کے منصبِ رسالت کی تکمیل میں اپنا جان و مال کھپایا یا نہیں کھپایا؟ دعوت الی اللہ میں صبر و استقامت دکھائی یا نہیں دکھائی؟ اگر یہ نہیں تو پھر کچھ بھی نہیں، پھر تو رسول اللہ ﷺ پر ایمان کا دعویٰ نا قابلِ قبول ٹھہرے گا، رسول ﷺ سے محبت کا دعویٰ بھی مسترد کر دیا جائے گا اور رسول ﷺ کی اطاعت کا دعویٰ بھی غیر معتبر اور محض ریا اور دکھاوا قرار پائے گا۔

دروں بینی کی ضرورت

اس حقیقت کو سمجھنے کے لئے ذرا چشمِ تصور میں غزوۂ احد کا نقشہ لائیے کہ محبوبِ خدا، سرورِ عالم، محمد رسول اللہ ﷺ اپنے جان نثار صحابہؓ کی معیت میں مشرکین کے سامنے سینہ سپر ہیں، آپ ﷺ اور آپؐ کے صحابہ رضی اللہ عنہم اس معرکۂ کارزار میں جان کی بازی لگا رہے ہیں، اس کشمکش میں رحمۃ للعالمین زخمی ہو گئے ہیں، خود کی کڑیاں سر مبارک میں گھس گئی ہیں، رخسار مبارک بھی مجروح ہو گیا ہے، دندانِ مبارک بھی شہید ہو چکے ہیں، آپؐ کا مقدس خون راہِ حق میں بہہ رہا ہے...... اور فرض کیجئے کہ عین اس وقت کوئی مدعیٔ عشقِ رسول ﷺ کہیں اپنے گھر میں بیٹھا درود کی تسبیح پڑھ رہا ہو، حضور ﷺ پر سلام پڑھ رہا ہو یا حضور ﷺ کی شان میں نعتیں پڑھے جا رہا ہو، تو یہ کتنی مضحکہ خیز بات ہوگی۔ اس طرزِ عمل کا ایمان بالرسولؐ اور محبتِ رسول ﷺ کے ساتھ کیا نسبت و تعلق؟ تو یہ طرزِ عمل کا ایمان بالرسولؐ اور محبتِ رسول ﷺ کے ساتھ کیا نسبت و تعلق؟ تو یہ طرزِ عمل کہ محمد رسول اللہ ﷺ تو کارزارِ احد میں، جہاں پر ہر چہار طرف موت کا رقص ہو رہا ہو، اپنے جاں نثاروں کے ساتھ اپنے خون سے ایک نئی تاریخ رقم فرما رہے ہوں اور اللہ کے جھنڈے کو سر بلند کرنے کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا رہے ہوں اور کوئی عاشقِ رسولؐ کہیں کسی گوشہ میں بیٹھا درود و سلام پڑھ رہا ہو، جس قدر مضحکہ خیز اس وقت ہوتا اسی قدر مضحکہ خیز آج بھی ہے۔ اس لئے کہ حضور ﷺ کا مشن مردہ نہیں

ہوا، زندہ و تابندہ ہے اور تا قیامت زندہ رہے گا۔ حضور ﷺ کی رسالت تا قیامِ قیامت ہے اور حضور ﷺ کے بعد یہ فریضۂ رسالت امتِ مسلمہ کو بحیثیتِ امت ادا کرنا ہے۔ بنی نوع انسان آج بھی ہدایتِ ربانی کی محتاج ہے۔ دنیا آج بھی طاغوتی شکنجے میں گرفتار ہے۔ آج بھی ہر اس شخص پر جو خود کو مسلمان سمجھتا ہے یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ بنی نوع انسان تک حق کا پیغام پہنچائے۔ حضور ﷺ کی بعثت صرف اہلِ عرب کے لئے نہ تھی بلکہ تمام بنی نوع انسان کے لئے تھی۔ حضور ﷺ کی بعثت ایک مخصوص زمانہ اور وقت کے لئے نہ تھی بلکہ قیامِ قیامت تک کے لئے تھی۔ توحید کی دعوت دینا، شرک کا ابطال کرنا اور اللہ کے دین کو عملاً غالب اور قائم کرنا محمد رسول اللہ ﷺ کا مقصدِ بعثت تھا۔ جیسا کہ فرمایا: ﴿هُوَ الَّذِیْۤ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّیْنِ كُلِّهٖ......﴾ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے قول کے مطابق اس آیت کی کامل شان کا ظہور ابھی باقی ہے۔ اس کا ظہور اس وقت تک نہ ہوگا جب تک اس پورے کرۂ ارضی پر اسی طرح اللہ کے دین کا جھنڈا نہیں لہراتا اور ادیانِ باطلہ کے جھنڈے سرنگوں نہیں ہو جاتے جس طرح محمد رسول اللہ ﷺ نے تیئیس سال کی محنتِ شاقہ کے نتیجہ میں جزیرہ نمائے عرب میں لہرایا تھا اور وہاں پہلے سے قائم طاغوتی نظام کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا تھا۔ چنانچہ جب تک یہ کام انجام تک نہ پہنچے، نبی اکرم ﷺ کا مقصدِ رسالت و بعثت ابھی شرمندۂ تکمیل ہے اور اس کی تکمیل کی ذمہ داری امتِ مسلمہ پر ہے۔ بقول علامہ اقبال ؎

وقتِ فرصت ہے کہاں کام ابھی باقی ہے
نورِ توحید کا اِتمام ابھی باقی ہے

پس اب اس مدعیٔ ایمان، اس عاشقِ رسولؐ اور اس محبِّ رسولؐ کو خوب اچھی طرح اپنے دل میں جھانک کر اپنا جائزہ لینا چاہئے جسے حضور ﷺ کے مقصدِ بعثت اور آپؐ کے مشن سے سرے سے کوئی دلچسپی نہ ہو اور اسے خود فیصلہ کرنا چاہئے کہ اس کے ان دعاوی میں کتنی صداقت ہے۔ آج عملاً یہ صورت حال رونما ہو چکی ہے کہ بقولِ حالی ؎

جو دین بڑی شان سے نکلا تھا وطن سے
پردیس میں وہ آج غریب الغرباء ہے

نبی اکرمؐ کی مستقبل کے بارے میں فہمائشیں

یہی وہ صورت حال ہے جس کی حضور ﷺ نے خبر دی تھی۔ صحیح مسلمؒ میں حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

بَدَاءَ الْاِسْلَامُ غَرِیْبًا وَسَیَعُوْدُ کَمَا بَدَاَ فَطُوْبٰی لِلْغُرَبَاءِ

''اسلام کی ابتدا غربت کی حالت میں ہوئی تھی اور یہ اسی حالت میں پھر لوٹ جائے گا۔ تو بشارت ہے ''غرباء'' کے لئے''

اردو میں غریب کے معنی مفلس و نادار کے ہوتے ہیں' لیکن عربی میں یہ لفظ ''اجنبی'' کے معنی میں آتا ہے۔ چنانچہ حدیث کا مفہوم یہ ہوگا کہ اسلام کا آغاز اجنبیت سے ہوا۔ جیسے ایک اجنبی مسافر اپنے اہل وعیال اور اپنے وطن سے دور رہ کر تنہائی میں زندگی بسر کرتا ہے' اسی طرح اسلام بھی ابتداء میں اجنبی اور تنہا تھا یعنی مسلمان بہت کم تھے۔ ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ وہ پھر غریب یعنی اجنبی ہو جائے گا۔ کفار' ملحدین اور مبتدعین کی کثرت ہوگی' اگرچہ نام کے مسلمان کثیر التعداد ہوں گے لیکن سچے' موحد' دیندار اور متقی افراد کم سے کم ہوتے چلے جائیں گے۔ تو ان قلیل 'غرباء' کے لئے (بہشت کی) بشارت اور مبارک باد ہے۔ مسند احمدؒ کی ایک روایت میں ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا:

اَلْغُرَبَاءُ الَّذِیْنَ یُحْیُوْنَ سُنَّتِیْ وَیُعَلِّمُوْنَهَا النَّاسَ

''غرباء وہ ہیں جو میری سنت کو زندہ کریں گے اور لوگوں کو اس کی تعلیم دیں گے۔''

(واضح رہے کہ حضور ﷺ کی سب سے بڑی اور سب سے اہم سنت دعوت وتبلیغ کی سنت ہے جس پر ان شاء اللہ آئندہ صفحات میں روشنی ڈالی جائے گی)

ایک اور روایت میں حضور ﷺ نے خبر دی کہ:

لَا یَبْقٰی مِنَ الْاِسْلَامِ اِلَّا اسْمُهٗ وَلَا یَبْقٰی مِنَ الْقُرْآنِ اِلَّا رَسْمُهٗ

''اسلام میں سے اس کے نام کے سوا کچھ باقی نہ رہے گا اور قرآن میں اس کے حروف کے سوا کچھ نہ بچے گا۔''

اس حدیث کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ روئے زمین پر اسلام کہیں فی الواقع قائم نظر نہیں آئے گا۔ انسانوں کے کردار اور ان کی شخصیتوں میں اسلام کو فی الواقع کارفرما دیکھنے کے لئے نگاہیں ترسیں گی۔ قرآن محض ایک مقدس کتاب کی حیثیت سے ریشمی جزدانوں میں لپیٹ کر رکھ دیا جائے گا اور اس نورِ ہدایت سے رہنمائی کی طلب مفقود ہو جائے گی۔ اس کی تلاوت صرف رسماً اور وہ بھی زیادہ سے زیادہ حصولِ ثواب یا ایصالِ ثواب کے لئے باقی رہ جائے گی۔

آج ہم دیکھتے ہیں کہ وہ صورت حال عملاً پیدا ہو چکی ہے جس کی خبر ان احادیثِ مبارکہ میں دی گئی ہے۔ اس صورت حال میں ہم میں سے ہر شخص پر لازم ہے کہ وہ اپنا جائزہ لے کر فیصلہ کرے کہ اگر اسے حضور ﷺ سے محبت ہے' اگر اسے حضور ﷺ سے کوئی مخلصانہ تعلق ہے' اگر وہ سمجھتا ہے کہ حضور ﷺ کے ساتھ اس کا رشتہ صحیح بنیادوں پر قائم ہے تو کیا اس کا مقصودِ حیات اور نصب العین بھی وہی ہے یا نہیں جو محمد رسول اللہ ﷺ کا مقصد بعثت تھا؟ یعنی اعلاءِ کلمۃ اللہ' اظہار دینِ الحق علی الدین کلہ اور تکبیر رب...... اگر ہم میں سے کسی کے مقاصدِ زندگی میں اللہ کے دین کو دنیا میں غالب کرنے کی سعی و جہد کرنے اور نورِ توحید سے پورے کرۂ ارضی کو منور کرنے کا عزم شامل نہیں اور اگر وہ حضور ﷺ کے مشن کی تکمیل میں حضور ﷺ کا دست بازو اور آپؐ کا ساتھی نہیں بن رہا تو اس کا حضور ﷺ سے تعلق درست نہیں' جس کی اسے فکر کرنی چاہئے۔ تو یہ ہے حضور ﷺ کے ساتھ ہمارے صحیح تعلق کی تیسری بنیاد جو ''وَنَصَرُوْهُ'' کی تشریح میں ہمارے سامنے آتی ہے۔

اتباع کا تقاضا

''نصرتِ رسولؐ'' کی مزید وضاحت ''اتباعِ رسولؐ'' کے حوالہ سے بھی ہوتی ہے۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا' اتباع کے معنی ہیں حضور ﷺ کے نقش قدم پر چلنا اور

حضور ﷺ کے ہر عمل کی پیروی کرنا۔ اب ہمیں غور کرنا چاہئے کہ نبی اکرم ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں جو عمل تواتر کے ساتھ ہوا ہے، پیہم و مسلسل ہوا ہے جو پورے تیئس برس تک شب و روز ہوا ہے، جس میں ایک لمحہ اور ایک گھڑی کا وقفہ نہیں، وہ عمل کیا ہے؟ نماز کے بارے میں پوچھا جا سکتا ہے کہ کب فرض ہوئی؟ رکعتوں کا تعین کب ہوا؟ کب دو تھیں، کب چار ہوئیں؟ روزوں کی فرضیت کب ہوئی؟ زکوٰۃ کا نظام کب قائم ہوا اور مقدارِ نصاب کب متعین ہوا؟ شراب و قمار کب حرام ہوئے؟ سود کی حرمت کا حکم کب نازل ہوا؟ ان سب کے لئے احادیث اور سیرت سے اوقات اور زمانے کا تعین کیا جا سکتا ہے، جس میں اختلاف بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن ایک بات متفق علیہ ہے جس میں کسی اختلاف اور قیل و قال کی گنجائش نہیں اور وہ بات یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے اول یومِ بعثت سے لے کر اس حیاتِ دنیوی کے آخری سانس تک جو عمل پیہم، مسلسل اور متواتر شب و روز کیا ہے، جلوت و خلوت میں کیا ہے، وہ عمل دعوت و تبلیغ کا عمل ہے، وہ تکبیرِ رب کی سعی و جہد ہے، وہ اعلائے کلمۃ اللہ کے لئے جہاد ہے۔ وہ دینِ حق کے سربلند کرنے کی تگ و دو ہے، وہ غلبہ و اقامتِ دین کے لئے مجاہدہ اور تصادم ہے۔ اس سعی و جہد اور مجاہدہ و جہاد کی شکلیں بدلی ہیں، صورتوں میں تبدیلی آئی ہے، بتدریج مختلف مراحل آئے ہیں۔ کہیں مکی دور میں یہ جدوجہد دعوت و تبلیغ اور شدائد و مصائب کے برداشت کرنے کے درجہ میں تھی، جس میں آپؐ کو طائف کے گلی کوچوں میں پتھر بھی کھانے پڑے۔ کہیں وہ مدنی دور میں باطل کے ساتھ مسلح تصادم کے نتیجے میں بدر و احد اور احزاب و تبوک کے معرکوں کی صورت میں ہویدا تھی، کہیں قبائل عرب اور قرب و جوار کے سلاطین کو وفود و خطوط کے ذریعہ دعوت دینے کے مراحل میں تھی، کہیں صلح حدیبیہ، فتح مکہ اور غزوۂ حنین کی صورت میں جاری و ساری تھی۔ لیکن آپؐ کا جو عمل تیئس سال کے عرصہ پر پھیلا ہوا ہے، ہر لمحہ ہر گھڑی اور ہر آن انجام دیا جا رہا ہے، وہ ہے عملِ دعوت و تبلیغ۔ اب جو شخص بھی متبعِ رسول ﷺ ہونے کا مدعی ہو، جو یہ سمجھتا ہو کہ سنتِ رسول ﷺ کا التزام ضروری ہے، اس کے بارے میں سب سے پہلے یہ دیکھنا ہوگا کہ اس کی زندگی میں آنحضور ﷺ کی سب سے بڑی، سب سے زیادہ متواتر، متفق علیہ اور ثابت شدہ سنت کس حال میں ہے؟ اس کے اندر دعوت و تبلیغ کی کتنی تڑپ اور کتنی لگن ہے؟ اور وہ اس کام میں کتنا وقت خرچ کر رہا ہے اور کتنا مال لگا رہا ہے؟

رسولؐ کی نصرت، اللہ کی نصرت ہے

نصرتِ رسولؐ کے حوالے سے قرآن مجید کا ایک اہم مقام سورۃ الصّف کی آخری آیت ہے جس میں حضرت عیسیٰؑ کا ایک قول نقل ہوا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اپنے حواریوں سے دریافت فرمایا: ﴿مَنْ اَنْصَارِیْۤ اِلَی اللّٰہِ﴾ یعنی ''اللہ کی راہ میں میرا مددگار کون ہے؟'' تکبیرِ رب، دعوتِ توحید، تبلیغِ دین اور نورِ ہدایت سے دنیا کو منور کرنے کا جو کام میرے سپرد ہوا ہے اس کی جدوجہد میں اب کون ہے جو میرا مددگار بنے؟ کون ہے جو اس راہ میں میرا دست و بازو بنے؟ آنحضرت ﷺ کے حواریوں کے جواب کو قرآن مجید یوں نقل فرماتا ہے: ﴿قَالَ الْحَوَارِیُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰہِ﴾ یعنی ''حواریوں نے کہا ہم ہیں اللہ کے مددگار''۔ حضرت مسیحؑ کے سوال اور حواریوں کے جواب کے الفاظ توجہ طلب ہیں۔ حضرت مسیحؑ نے دریافت کیا تھا: ﴿مَنْ اَنْصَارِیْۤ اِلَی اللّٰہِ﴾ جواب دیا گیا: ﴿نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰہِ﴾ جواب میں نصرت کی نسبت بدل گئی۔ اس نسبت کی تبدیلی میں حکمت یہ ہے کہ رسولؐ کی نصرت اللہ کی نصرت ہے اور فریضۂ رسالت کی ادائیگی میں جو شخص رسولؐ کا حامی، مددگار اور دست و بازو بنتا ہے، اس راہ میں جانفشانی اور سرفروشی کا مظاہرہ کرتا ہے اور اپنا جان و مال کھپاتا ہے، وہ اللہ کے رسولؐ کی نصرت بھی کر رہا ہے اور اللہ کی نصرت میں بھی لگا ہوا ہے۔ چنانچہ غلبہ و اقامتِ دین کی جدوجہد کو اللہ تعالیٰ اپنی اور اپنے رسولؐ دونوں کی نصرت سے تعبیر فرماتا ہے۔

۴۔ اتباعِ قرآن مجید

اب اس کے بعد نبی اکرم ﷺ سے ہمارے صحیح تعلق کی چوتھی بنیاد کا ذکر ہے اور وہ ہے نورِ قرآن مجید کو حرزِ جان بنانا، اسے اپنا رہنما قرار دینا اور اس کا اتباع کرنا۔ فرمایا: ﴿وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِیْۤ اُنْزِلَ مَعَهٗ﴾ ''اور اتباع کیا اس نور کا جو ان (ﷺ)

کے ساتھ (یا ان پر) نازل کیا گیا۔'' یہاں نور سے مراد قرآن ہے' یہ وہ نورِ ہدایت ہے جو حضور اکرم ﷺ پر نازل ہوا' اس کا اتباع لازم ہے۔ غور کرنے کی بات یہ ہے کہ جو تین اصطلاحات پہلے بیان ہو چکیں یعنی ''اٰمَنُوْا بِہٖ وَعَزَّرُوْہُ وَنَصَرُوْہُ'' تو وہ انتہائی جامع تھیں۔ اب اس چوتھی بات کا اضافہ کس مقصد کے لئے کیا جا رہا ہے کہ ''وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ!'' یہ اس لئے ضروری تھا کہ نبی اکرم ﷺ بہر حال اس دنیا میں تشریف لے جانے والے تھے۔ ایک معین مدت تک کے لئے ہی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو حضور ﷺ کے وجودِ قدسی کی معیت اور صحبت حاصل رہنی تھی۔ آنحضور ﷺ کے اس دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد ابدالآباد تک کے لئے جس چیز کو محمد رسول اللہ ﷺ کا جانشین اور قائم مقام بننا تھا وہ یہی قرآن مجید ہے' جو فرقانِ حمید بھی ہے اور کتابِ مبین بھی۔ یہ اللہ کا وہ کلام ہے جو محمد رسول اللہ ﷺ پر نازل کیا گیا' گویا آپ ﷺ کے ساتھ اترا۔ اور یہ وہ نور ہے جو دائم وقائم ہے۔ بقول اقبالؒ

مثلِ حق پنہاں و ہم پیداست اُو
زندہ و پائندہ و گویاست اُو

چنانچہ حجۃ الوداع کے خطبہ میں حضور ﷺ نے جو آخری بات فرمائی وہ اسی قرآن مجید کے بارے میں تھی۔ مسلم شریف کی روایت میں خطبہ حجۃ الوداع کے اختتامی اور آخری الفاظ یہ ہیں:

((وَقَدْ تَرَکْتُ فِیْکُمْ مَا اِنِ اعْتَصَمْتُمْ بِہٖ فَلَنْ تَضِلُّوْا اَبَدًا وَھُوَ کِتَابُ اللّٰہِ))

کہ میں تمہارے درمیان وہ چیز چھوڑے جا رہا ہوں' جس کا سر رشتہ اگر تم مضبوطی سے تھامے رکھو گے تو تم تا ابد (کبھی) گمراہ نہیں ہو گے' وہ چیز ہے کتاب اللہ۔

نبی اکرم ﷺ کے اس ارشادِ گرامی کے بارے میں گفتگو سے قبل مناسب ہو گا کہ ہم اس ارشادِ گرامی کا موقع اور محل اچھی طرح سمجھ لیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حجۃ الوداع کے موقع پر حضور اکرم ﷺ نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ آپؐ کشمکشِ حیات کی آخری منزلیں طے فرما رہے ہیں۔ اس احساس کا اظہار پورے خطبہ میں موجود ہے' بلکہ خطبہ کا آغاز ہی آپؐ نے ان الفاظ سے فرمایا:

''اَیُّھَا النَّاسُ اِسْمَعُوْا قَوْلِیْ فَاِنِّیْ لَا اَدْرِیْ لَعَلِّیْ لَا اَلْقَاکُمْ بَعْدَ عَامِیْ ھٰذَا بِھٰذَا الْمَوْقِفِ اَبَدًا''

لوگو! میری بات غور سے سنو' کیونکہ شاید اس سال کے بعد اس مقام پر میں تم سے دوبارہ نہ مل سکوں۔

چنانچہ اس خطبہ میں حضور ﷺ کے ارشادات کا انداز وصیت کا سا ہے یعنی امت کو ان امور کی تاکید و تلقین جن کی دین و شریعت میں اساسی حیثیت ہے۔ خطبے کے آخری حصے میں آپ ﷺ نے یہ بات تاکیداً ارشاد فرمائی کہ میرے بعد قرآن کو تھامنا' اسے حرزِ جان بنانا' اس کے دامن سے وابستہ رہنا اور ہرگز یہ خیال نہ کرنا کہ میں تم کو بے یار و مددگار چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ تمہاری ہدایت اور رہنمائی کے لئے میں اپنے پیچھے اللہ کی کتاب چھوڑے جا رہا ہوں' اللہ کا نازل کردہ وہ نور چھوڑے جا رہا ہوں جو تمہیں کفر و شرک کے اندھیروں سے نکال کر توحید کے صراطِ مستقیم کی طرف لے جائے گا۔ اگر تم اس قرآن کو مضبوطی سے تھامے رہو گے تو کبھی گمراہ نہیں ہو گے۔

حبل اللہ

یہ بات نوٹ کرنے کی ہے کہ حضور اکرم ﷺ کے فرمودات کی رُو سے قرآن مجید ہی وہ ''حبل اللہ'' ہے جس کے ساتھ چمٹ جانے اور وابستہ ہو جانے کا سورۂ آل عمران میں حکم آیا ہے۔ اس سلسلے کا پہلا حکم سورۃ الحج میں وارد ہوا ہے جس کی آخری آیت میں فرمایا گیا: ''وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰہِ'' اللہ کے ساتھ چمٹ جاؤ' اس کے دامن سے وابستہ ہو جاؤ۔'' سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ اللہ سے کیسے چمٹیں' اس کے دامن سے کیسے وابستہ ہوں؟ سورۂ آل عمران میں اس کو مزید کھولا گیا: ''وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ'' کہ اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامو۔ اللہ کی رسی کے ساتھ چمٹ جاؤ۔ اس وضاحت کے باوجود یہ سوال باقی رہا کہ پھر حبل اللہ سے کیا مراد ہے' کیسے تھامیں؟ کس سے جڑیں؟ اس کی شرح و توضیح نبی اکرم ﷺ نے فرما دی اور وحی متلو کے ذریعہ امت کو مطلع فرما دیا

کہ اللہ کی یہ کتاب قرآن مجید ہی درحقیقت اللہ کی وہ مضبوط رسی ہے جس سے اعتصام کا' جس کے ساتھ چمٹ جانے اور جڑ جانے کا اور جس کو تھام لینے کا حکم سورۂ آل عمران میں دیا گیا ہے۔ چنانچہ ایک نہایت جامع حدیث میں جس کے راوی حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں اور جس میں قرآن مجید کی عظمت وشوکت' اس کے مرتبہ ومقام اور اس کی اہمیت کا بیان مفصل انداز میں ہوا ہے' نبی اکرم ﷺ کے یہ الفاظ نقل ہوئے ہیں: ''**هُوَ حَبْلُ اللّٰهِ الْمَتِيْنُ**'' یعنی ''یہی قرآن اللہ کی مضبوط رسی ہے۔'' اسی طویل حدیث میں قرآن حکیم کی شان میں حضور ﷺ کے یہ الفاظ بھی لائق توجہ ہیں کہ ''قرآن مجید وہ کتاب ہے جس سے علماء کبھی سیری محسوس نہیں کریں گے' نہ کثرت اور تکرارِ تلاوت سے اس کتاب پر کبھی باسی پن طاری ہوگا اور نہ ہی اس کے عجائبات کبھی ختم ہوں گے'' یعنی اس کے علوم ومعارف کا خزانہ کبھی ختم نہیں ہوگا اور کان سے حکمت و معارف کے نئے نئے موتی اور جواہرات برآمد ہوتے رہیں گے۔ (یہ حدیث صحیح ترمذی اور سنن دارمی میں روایت ہوئی ہے۔)

ہماری حالتِ زار

نبی اکرم ﷺ نے تو خطبہ حجۃ الوداع میں فرمایا تھا کہ قرآن کو مضبوطی سے تھامو گے تو تا ابد گمراہ نہیں ہوگے' لیکن بدقسمتی سے اسی حبل اللہ سے ہم اپنا تعلق توڑتے چلے گئے۔ جب حبل اللہ کو مضبوطی سے تھامنے اور اس کے ساتھ پورے طور پر وابستہ ہو جانے کا نتیجہ گمراہی سے حفاظت قرار پایا تو ظاہر بات ہے کہ اس کو چھوڑنے کا نتیجہ گمراہی کی صورت ہی میں ظاہر ہونا چاہئے۔ اپنی تاریخ کے اوراق پلٹ کر دیکھیں' آپ کو واضح طور پر نظر آئے گا کہ جب تک مسلمانوں نے قرآن کو مضبوطی سے تھامے رکھا' اسی کو حقیقی معنوں میں اپنا ہادی ورہنما سمجھا' اپنے عمل' اخلاق اور معاملات کو اسی کے مطابق استوار رکھا تو انفرادی اور اجتماعی' ہر سطح پر ان کا رعب اور دبدبہ قائم رہا' دنیا میں وہ سربلند اور غالب رہے اور اسلام کا جھنڈا چہار دانگِ عالم میں لہراتا رہا' لیکن جیسے جیسے وہ کتاب اللہ سے بے پروا ہوتے اور نور وحکمت کے اس خزینہ سے بے تعلق ہوتے چلے گئے ویسے ویسے ان پر زوال کے سائے گہرے ہوتے گئے اور وہ بتدریج فساد اور انحطاط میں مبتلا ہوتے چلے گئے اور نتیجتاً مغلوب ومقہور ہوگئے۔ ان کے عقائد خراب ہوئے' اعمال بگڑے اور ان میں بدعات اور ہوائے نفس کو دراندازی کا موقع ملا۔ ان کا اتحاد پارہ پارہ ہوا اور بجائے اس کے کہ وہ بنیانِ مرصوص بنتے' بے شمار فرقوں اور قومی ونسلی اور لسانی وجغرافیائی گروہوں میں تقسیم ہو کر رہ گئے۔ قرآن سے ہمارا جو حقیقی تعلق ہونا چاہئے آج اسے ہم ترک کر چکے ہیں۔ ہمارا اس سے تعلق اس کے سوا اور کچھ نہیں رہا کہ ہم اسے محض حصولِ برکت کا ایک ذریعہ سمجھتے ہیں۔ ہم میں سے گنتی کے چند لوگ اگر اس کی تلاوت کرتے بھی ہیں تو اسے سمجھنے اور اس سے ہدایت اخذ کرنے کے لئے نہیں' بلکہ محض حصولِ ثواب کے لئے! بلکہ میں تو کہا کرتا ہوں کہ اب تو حصولِ ثواب کا معاملہ بھی ختم ہوا' اب تو صرف ایصالِ ثواب کی مجالس کے لئے قرآن خوانی رہ گئی ہے۔ گویا اپنے لئے بھی اب ہم تلاوتِ قرآن کے ذریعے حصولِ ثواب کی کوئی خاص حاجت محسوس نہیں کرتے بلکہ اب تو قرآن مجید ہمارے نزدیک صرف مردوں کو ثواب پہنچانے کا ایک ذریعہ بن کر رہ گیا ہے!! بقول اقبال ؎

بآیاتش ترا کارے جز ایں نیست
کہ از یسینِ اُو آساں بمیری

سورۃ الفرقان میں اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم ﷺ کا ایک استغاثہ نقل فرمایا ہے:
﴿**وَقَالَ الرَّسُوْلُ يٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا**﴾ یعنی ''اور کہا رسولؐ نے کہ اے میرے رب' میری قوم نے اس قرآن کو پسِ پشت ڈال دیا تھا (نظر انداز کر دیا تھا)'' اگرچہ سیاق وسباق کے لحاظ سے اس آیت میں اصلاً تذکرہ ان کفار کا ہے جن کے نزدیک قرآن مجید سرے سے کوئی قابلِ التفات چیز تھی ہی نہیں اور جو قرآن مجید کو اللہ تعالیٰ کا کلام اور وحیِ ربانی تسلیم ہی نہیں کرتے تھے' تاہم قرآن کے وہ ماننے والے بھی اس کی ذیل میں آتے ہیں جو عملاً قرآن کے ساتھ عدمِ توجہ و التفات کی روش اختیار کریں یعنی جو نہ اس کی تلاوت کو اپنے معمولات میں شامل کرتے

ہوں، نہ اسے اپنے غور وفکر کا موضوع بناتے ہوں اور نہ ہی اسے اپنی زندگی کا لائحہ عمل بنانے پر آمادہ ہوں ۔ یہاں آیت زیرِنظر ''وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ مَعَہٗ'' میں ''اتباع'' کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کے معنی ہیں پیروی کرنا۔ ہر حکم، ہر ہدایت، ہر امر و ہر نہی کی تعمیل کرنا۔ ہمارا قرآن حکیم کے ساتھ اگر اس نوع کا تعلق ہوگا تو ہم نہ صرف یہ کہ گمراہی سے محفوظ رہ سکیں گے بلکہ نبی اکرم ﷺ کے ساتھ ہماری نسبت بھی صحیح بنیادوں پر استوار رہ سکے گی!...... یہاں یہ بات اب بالکل واضح ہوگئی کہ کتاب اللہ کو مضبوطی سے تھامنا، اس کو اپنی زندگی کے ہر معاملہ میں ہادی، حکم اور راہنما قرار دینا، اس کی تعلیمات پر عمل کرنا، اس کی صبح وشام تلاوت کرنا، اس میں تدبر اور غور وفکر کرنا، اس کو حرزِ جان بنانا، اس کا اتباع کرنا، یہ ہے نبی اکرم ﷺ سے ہمارے صحیح تعلق کی چوتھی بنیاد۔ گویا اگر ہم اس کتاب سے جڑے تو محمد ﷺ سے جڑ گئے اور اس سے کٹے تو محمد ﷺ سے کٹ گئے۔

اصلاحِ حال کا واحد طریق

قرآن مجید کے ساتھ ہمارا طرزِ عمل کیا ہونا چاہئے، اس ضمن میں یہ حدیث شریف نہایت جامع ہے جو حضرت عبیدہ ملیکی ؓ سے مروی ہے اور جس کے مطابق آنحضور ﷺ نے فرمایا:

یَآاَھْلَ الْقُرْاٰنِ لَا تَتَوَسَّدُوا الْقُرْاٰنَ وَاتْلُوْہُ حَقَّ تِلَاوَتِہٖ مِنْ اٰنَاءِ اللَّیْلِ وَالنَّھَارِ وَاَفْشُوْہُ وَتَغَنَّوْہُ وَتَدَبَّرُوْا فِیْہِ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ

(البیھقی فی شعب الایمان)

''اے قرآن والو! قرآن کو بس اپنا تکیہ ہی نہ بنالو، بلکہ دن اور رات کے اوقات میں اس کی تلاوت کیا کرو جیسا کہ اس کی تلاوت کا حق ہے اور اس کو (چہار دانگِ عالم) میں پھیلاؤ، اور اس کو خوش الحانی سے حظ لیتے ہوئے پڑھا کرو، اور اس میں تدبر اور غور وفکر کیا کرو ...... تاکہ تم فلاح پاؤ''

اس حدیث مبارک میں مسلمانوں کو حضور ﷺ نے اہلِ قرآن کا خطاب دیا ہے: (یَآاَھْلَ الْقُرْاٰنِ) یہ خطاب ہم وزن ہے اس خطاب کے جو قرآن یہود ونصاریٰ کو دیتا ہے ''یٰٓاَھْلَ الْکِتٰبِ'' الکتاب کا آخری، مکمل اور جامع ایڈیشن ''القرآن'' ہے جس کی حامل امتِ مسلمہ ہے۔ اسی مناسبت سے حضور ﷺ نے امت کو ''یٰٓاَھْلَ الْقُرْاٰنِ'' کے الفاظ سے مخاطب فرمایا۔ سبحان اللہ، کتنا پیارا خطاب ہے جو اس امت کو ملا۔ میں اس سے قبل بھی کسی موقع پر یہ عرض کر چکا ہوں کہ ہماری بہت سی غلطیوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ جن لوگوں نے غاصبانہ طور پر اپنے لئے ''اہلِ قرآن'' کا عنوان اختیار کیا، ہم نے بھی ان کو اسی نام سے پکارنا شروع کر دیا۔ حالانکہ یہ نام انہوں نے حدیث کے بارے میں اپنی گمراہ کن نظریات پر پردہ ڈالنے کے لئے اختیار کیا تھا۔ ان کا اصل نام ہونا چاہئے تھا ''منکرینِ سنت'' یا ''منکرینِ حدیث'' ہماری یہ بڑی نادانی ہے کہ ہم نے ان کے اس قبضۂ غاصبانہ کو تسلیم کرلیا اور ان کو یہ نام الاٹ کر دیا جس کے ہرگز وہ اہل نہیں ہیں! یہ خطاب تو حضور ﷺ نے اپنی امت کو دیا تھا، منکرینِ حدیث کو نہیں!

اس حدیث کا ایک ایک لفظ لائقِ توجہ ہے۔ کس قدر جامع ہیں نبی اکرم ﷺ کے یہ الفاظ جن میں مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق کا کمال اختصار کے ساتھ احاطہ کرلیا گیا ہے۔ یہاں اس حدیث کی تشریح تو پیشِ نظر نہیں ہے، محض ایک نکتے کی جانب اشارہ کرکے ہم آگے بڑھیں گے۔ ''یَا اَھْلَ الْقُرْاٰنَ لَا تَتَوَسَّدُوا الْقُرْاٰنَ'' کا سادہ سا ترجمہ تو یہ ہوگا کہ اے اہلِ قرآن اس قرآن کو تکیہ نہ بنالینا۔ لیکن یہاں تکیہ کا لفظ نہایت معنی خیز ہے۔ تکیہ چونکہ کمر کے پیچھے لگایا جاتا ہے لہٰذا ایک مطلب تو یہ ہوا کہ اس قرآن کو پس پشت نہ ڈال دینا، اسے نظر انداز نہ کر دینا۔ پھر یہ کہ تکیہ چونکہ سہارے کے طور پر استعمال ہوتا ہے تو اس اعتبار سے مفہوم یہ ہوگا کہ اس قرآن کو محض ایک سہارا نہ بنا لینا کہ بس اپنے ذہن میں اس کتاب کی تقدیس کا ایک گوشہ کھول کر اور اسے نہایت قیمتی جز دان میں اونچی طاق پر رکھ کر بڑے مطمئن ہوجاؤ کہ اس کی موجودگی باعثِ برکت ہے۔ اس کتابِ مبین سے ہمارا عملی تعلق بس اتنا رہ گیا ہے کہ کہیں قسم کھانے کی ضرورت پڑتی ہے، چاہے وہ جھوٹے قسم ہی کیوں نہ ہو تو اس کے لئے اس کتاب کو تختۂ مشق بنایا

جاتا ہے' دم توڑتے شخص کو سورۂ یٰسین پڑھ کر سنا دی جاتی ہے' یا بیٹی کو قرآن کا ایک نسخہ جہیز میں دے کر ایک رسم پوری کر دی جاتی ہے۔ اللہ اللہ اور خیر سلا! قرآن حکیم کے ساتھ ہمارا عملی رویہ تو وہ ہونا چاہئے جو اس حدیث کی رو سے سامنے آتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس حدیث کے ایک ایک لفظ میں ہمارے لئے فکری و عملی رہنمائی کا وافر سامان موجود ہے۔

اللہ کے اس نور کا جو محمد ﷺ کے توسط سے ہم کو ملا' جب ہم نے اتباع چھوڑ دیا تو اس دنیا میں اس کا یہ نتیجہ ہمارے سامنے ہے کہ ہم یہاں ذلت و رسوائی کا ایک عبرت ناک مرقع بنے ہوئے ہیں۔ رہا عذابِ اُخروی' تو اس کے سزاوار بننے میں بھی ہم نے کوئی کسر اٹھا نہیں چھوڑی۔ اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم اور اس کی رحمت ہماری دستگیری فرمائے اور وہ ہمارے خطاؤں سے درگزر فرمائے تو دوسری بات ہے۔ اللہ اکبر کیسا صادق آتا ہے ہمارے حال پر آنحضور ﷺ کا یہ فرمان جسے حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے امام مسلم نے اپنی صحیح میں روایت کیا ہے کہ ''اِنَّ اللّٰہَ یَرْفَعُ بِھٰذَا الْکِتَابِ اَقْوَامًا وَیَضَعُ بِہٖ اٰخَرِیْنَ'' یعنی اللہ تعالیٰ یقیناً اس کتابِ عزیز کی وجہ سے کچھ قوموں کو عزت و سربلندی عطا فرمائے گا اور دوسروں کو (اس کتاب کو چھوڑنے کے باعث) ذلت و نکبت سے دوچار کرے گا۔'' گویا دنیا میں بحیثیتِ قوم ہماری تقدیر اسی کتاب کے ساتھ وابستہ ہے۔ اس حدیث کی بہت عمدہ تعبیر کی ہے علامہ اقبال نے اپنے اس شعر میں کہ ؎

وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر
اور ''ہم'' خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر

آیت زیر نظر کی اس ٹکڑے ''وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ مَعَہٗٓ'' پر غور کرنے سے یہ حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ اس میں ایمانِ بالرسالت' توقیر و تعظیمِ رسول ؐ اور نصرتِ رسول ؐ یعنی نبی اکرم ﷺ سے ہمارے تعلق کی ان تینوں بنیادوں کا بھی پوری طرح احاطہ کر لیا گیا ہے جو پہلے بیان ہو چکی ہیں۔ اور اسی طرز عمل اور اسی روش کو اللہ تعالیٰ نے فوز و فلاح کا ضامن قرار دیا ہے' چنانچہ اس آیت کا اختتام ان الفاظ پر ہوتا ہے: ﴿اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴾ آیت کے اس حصے سے صاف طور پر مترشح ہے کہ فلاح و صلاح اور نجات' نبی اکرم ﷺ سے تعلق کی ان چار بنیادوں کی درستگی پر موقوف ہے۔

اپنی گفتگو کو ختم کرنے سے قبل ایک بات مزید عرض کرنا چاہوں گا۔ میرے نزدیک مسلمانوں کی زبوں حالی اور اس کا زوال و انحطاط دراصل قرآن مجید سے دوری کا نتیجہ ہے۔ یہی بات بلند پایہ علمائے اسلام تقریروں اور تحریروں میں کہتے چلے آئے ہیں' جن میں سے ایک ایسی بزرگ ہستی کا حوالہ میں اس وقت پیش کروں گا جو مجھ سے لاکھوں درجہ بلند و برتر شخصیت ہیں۔ وہ ماضی بعید کی نہیں' ماضی قریب کی ایک مسلمہ محترم شخصیت ہیں اور وہ ہیں شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندیؒ۔ پہلی جنگ عظیم (۱۹۱۴ء تا ۱۹۱۸ء) کے دوران حکومتِ برطانیہ نے شیخ الہندؒ کو مالٹا میں اسیر کر دیا تھا۔ مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے اپنی تالیف ''وحدتِ اُمت'' میں لکھا ہے کہ ۱۹۲۰ء میں شیخ الہندؒ جب اسارتِ مالٹا سے واپس آئے تو ایک دن دارالعلوم دیوبند کے اکابر اور علماء کو جمع کیا اور فرمایا:

> ''میں نے جہاں تک جیل کی تنہائیوں میں اس پر غور کیا کہ پوری دنیا میں مسلمان دینی اور دنیوی ہر حیثیت سے کیوں تباہ ہو رہے ہیں' تو اس کے دو سبب معلوم ہوئے۔ ایک ان کا قرآن کو چھوڑ دینا' دوسرے آپس کے اختلافات اور خانہ جنگی۔ اس لئے میں وہیں سے یہ عزم لے کر آیا ہوں کہ اپنی باقی زندگی اس کام میں صرف کروں گا کہ قرآن کریم کو لفظاً اور معناً عام کیا جائے۔ بچوں کے لئے لفظی تعلیم کے مکاتب بستی بستی قائم کئے جائیں' بڑوں کو عوامی درسِ قرآن کی صورت میں اس کے معانی سے روشناس کرایا جائے اور قرآنی تعلیمات پر عمل کے لئے انہیں آمادہ کیا جائے' اور مسلمانوں کے باہمی جنگ و جدال کو کسی قیمت پر برداشت نہ کیا جائے۔''

میں شیخ الہندؒ کی تشخیص کو صد فیصد صحیح سمجھتے ہوئے اور موجودہ تمام حالات کا تجزیہ کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ جو لوگ حقیقی معنوں میں اسلام کی روشنی میں

پاکستان میں اصلاحِ احوال کے آرزومند ہیں ان کی تمام تر توجہ اللہ تعالیٰ کی اس کتابِ عزیز کی خدمت کی طرف مرکوز ہو جانی چاہئے۔قرآن مجید کو پڑھنے اور پڑھانے، سمجھنے اور سمجھانے اور اس کو اپنی زندگی کا لائحہ عمل بنانے کی دعوت کو کامیاب کرنے کے لئے اپنی بہترین عملی جدوجہد اور قوتوں کو صرف کرنا اگر ہمارا نصب العین بن گیا اور ہمارے معاشرہ میں یہ بات ایک تحریک کی صورت میں چل نکلی تو جملہ مسائل حل ہوتے چلے جائیں گے۔ایمان و یقین اسی کتاب سے حاصل ہوگا، عقائد اسی سے درست ہوں گے، جاہلیتِ قدیمہ و جدیدہ کا ابطال اسی فرقان حمید سے ہوگا۔شرکت و بدعت کے اندھیرے اسی نورِ ہدایت کی ضیا پاشی سے دور ہوں گے، عمل و اخلاق کی اصلاح اور ان میں تبدیلی اسی کی تعلیمات سے ہوگی۔معاملات اگر سنوریں گے تو اسی کتاب مبین کی رشد و ہدایت سے سنوریں گے۔اور اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ ہمارے ملک میں اسلامی نظام بھی اسی حبل اللہ کے اعتصام اور اس سے تمسک کے نتیجہ میں قائم ہوگا۔اس کی بنیاد پر جو دعوت اٹھے گی اور نبی اکرم ﷺ کے طریق پر جو انقلابی کام ہوگا اسی کے نتیجے میں یہاں اسلامی نظام کا قیام ممکن ہو سکے گا۔کسی اور ذریعے سے یہ تبدیلی ممکن نہیں ہے!

تعلیم و تعلمِ قرآن کی عظمت و اہمیت اور قرآن حکیم کے ''حبل اللہ'' ہونے کے بارے میں درج ذیل تین احادیث نہایت اہم اور جامع ہیں۔انہیں اپنے ذہن نشین کر لیجئے۔پہلی حدیث کے راوی ہیں حضرت عثمان بن عفان ؓ۔صحیح بخاری اور دیگر کتب حدیث میں یہ روایت موجود ہے کہ آنحضور ﷺ نے فرمایا: ''خَیْرُکُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْاٰنَ وَعَلَّمَهٗ''، یعنی ''تم میں سے بہترین وہ ہیں جو قرآن کا علم حاصل کرتے ہیں اور دوسروں کو اس کی تعلیم دیتے ہیں۔''

دوسری حدیث طبرانی کبیر میں حضرت جبیر بن مطعم ؓ سے مروی ہے:

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَلَیْسَ تَشْهَدُوْنَ اَنْ لَا اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِیْکَ لَهٗ وَاَنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَاَنَّ الْقُرْاٰنَ جَاءَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ؟ قُلْنَا بَلٰی قَالَ: فَاَبْشِرُوْا فَاِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ طَرَفُهٗ بِیَدِ اللّٰهِ وَطَرَفُهٗ بِاَیْدِیْکُمْ فَتَمَسَّکُوْا بِهٖ فَاِنَّکُمْ لَنْ تَهْلِکُوْا وَلَنْ تَضِلُّوْا بَعْدَهٗ اَبَدًا

نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ''کیا تم اس بات کی گواہی نہیں دیتے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ تنہا ہے اور اس کے ساتھ کوئی شریک نہیں اور یہ کہ میں اللہ کا رسول ہوں اور یہ کہ قرآن اللہ کے پاس سے آیا ہے؟'' ہم نے عرض کیا: ''یقیناً! تب آپؐ نے فرمایا: ''پس تم خوشیاں مناؤ، اس لئے کہ اس قرآن کا ایک سرا اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے اور ایک (دوسرا) سرا تمہارے ہاتھ میں۔ پس اسے مضبوطی سے تھامے رکھو! (اگر تم نے ایسا کیا) تو تم اس کے بعد نہ کبھی ہلاک ہوگے اور نہ کبھی گمراہ۔''

تیسری حدیث کے راوی حضرت ابوسعید الخدری ؓ ہیں۔وہ فرماتے ہیں:

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ کِتَابُ اللّٰهِ هُوَ حَبْلُ اللّٰهِ الْمَمْدُوْدُ مِنَ السَّمَآءِ اِلَی الْاَرْضِ

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ کی کتاب ہی اللہ کی وہ رسی ہے جو آسمان سے زمین تک پہنچی ہوئی ہے۔''

حرفِ آخر

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ حضور ﷺ کے ساتھ ہمارے تعلق کی چار بنیادوں میں سے اولین بنیاد ''ایمان'' ہے اور دوسری توقیر و تعظیم، جو دراصل ایمان ہی کا فوری لازمی تقاضا ہے۔ایمان و تعظیم ہی کا لازمی تقاضا یہ بھی ہے کہ رسول ﷺ کی پورے طور پر اطاعت کی جائے اور یہ کہ ہمارے دلوں میں رسول ﷺ کی محبت دوسرے تمام انسانوں سے بڑھ کر ہو۔ان دونوں چیزوں کے اجتماع کا نام ''اتباعِ رسولؐ'' ہے جو فی الاصل مطلوب ہے۔حضور ﷺ سے ہمارے تعلق کی تیسری بنیاد ''نصرت'' ہے۔اس نصرت کی ضرورت نبیؐ کو اپنے کسی ذاتی کام کے لئے نہیں، بلکہ اپنے مشن کی تکمیل یعنی غلبۂ دین کی جدوجہد میں انہیں معاون اور دست و بازو درکار ہیں۔حضور ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں آپ ﷺ کے مقصدِ بعثت کی تکمیل ایک درجہ میں ہوئی یعنی جزیرہ نمائے عرب کی حد تک۔حالانکہ آپ ﷺ کی بعثت کل روئے ارضی کے تمام انسانوں

کے لئے ہے۔ چنانچہ وسیع تر سطح پر دعوت و تبلیغ کا کام اور پورے کرۂ ارضی پر غلبہٗ دین کا مشن ہنوز شرمندۂ تکمیل ہے۔ یہ قرض امت کے ذمہ ہے' اس مشن کی تکمیل کا بوجھ امت کے کندھوں پر ہے۔ یہ امانت نبی اکرم ﷺ کی طرف سے ہر اس شخص کی طرف منتقل ہوئی ہے جو رسول اللہ ﷺ کے دامن سے وابستہ ہے اور حضور ﷺ کا نام لیوا ہے۔ حضور ﷺ کے ساتھ ہمارے صحیح تعلق کی چوتھی بنیاد ''اتباعِ قرآن مجید'' ہے۔ اس آخری بنیاد میں ہمارے لئے اس طریق کار کی طرف بھی رہنمائی کر دی گئی ہے جس پر کاربند ہو کر دعوت الی اللہ کا فریضہ اور تواصی بالحق کی ذمہ داری ادا کرنی ہے۔ اس کتاب کو مضبوطی سے تھام کر' اس کے داعی' علمبردار اور پیغامبر بن کر ہمیں دنیا کے سامنے کھڑے ہونا ہے۔ حضور ﷺ کے مشن کی تکمیل کے لئے جدوجہد کا یہی صحیح طریقہ ہے اور اسی میں دنیوی و اُخروی فوز و فلاح مضمر ہے۔

و آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین OO